امرتا پریتم

پنجر

پنجر

(ایک ناول)

امرتا پریتم



سیمانت پرکاشن

دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ISBN : 81-87394- 2 8'-5

قیمت: ایک سو ساٹھ روپے

اشاعت: 2004

طباعت: انیس آفسیٹ پرنٹرز، دہلی ۶

کمپوزنگ: خیر کمپیوٹر، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

ناشر: نریندر ناتھ سوز

سیمانت پرکاشن

۹۲۲، کوچہ روہیلا [illegible]

دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

PINJAR *AMRITA PRITAM*

(Novel) U S $ 7-00 Rs. 160=00



SEEMANT PRAKASHAN

922, Kucha Rohella Khan, Daryaganj,

New Delhi-110002 (India)

Phone: 23270284

انتساب

افضل توصیف

کے نام

امرتا پریتم

ایک بے بس عورت کی کہانی..... امرتہ پریتم کی زبانی.....عورت جو انتقام کا شکار ہوئی، جو اپنے بطن کے بیٹے کو بھی ماں کا پیار نہ دے سکی، جو تاعمر اپنے گھر، اپنے کنبے اور اپنے منگیتر کو نہ بھلا سکی۔ جس نے تقسیم کی خوں ریزی میں خود کو خطرے میں ڈالا اور دوسری عورتوں کی عصمت وعفت کی حفاظت کی لیکن خود..... موقع ملنے پر بھی اپنے بیٹے کی خاطر واپس نہ جا سکی اپنے کنبہ میں، اپنے عزت کے گہوارے میں۔

سرمئی دن تھا، بوری کے ایک ٹکڑے کو پاؤں کے نیچے دبائے ہوئے پارو مٹر کے دانے نکال رہی تھی، انگلیوں میں دبائی ہوئی پھلیوں کے منھ کو کھول کر جب اس نے دانوں کو مٹھی میں جمع کرنا چاہا تو ایک سفید کیڑا اس کے انگوٹھے میں چمٹ گیا۔ جیسے کسی کا پاؤں کیچڑ سے بھرے ہوئے گڑھے میں جا پڑے۔ اس سے پارو کو گھن محسوس ہوئی۔ جھٹک کر اس نے کیڑے کو دور پھینک دیا اور اپنے ہاتھوں کو اپنے دونوں گھٹنوں میں دبا لیا بھری ہوئی پھلیاں، نکالے ہوئے دانے اور مٹر کے چھلکے پارو کے آگے بکھرے پڑے رہے۔ جوڑے ہوئے گھٹنوں میں سے اس نے دونوں ہاتھ نکال کر اپنے کلیجے کو تھام لیا۔

پارو کو ایسا محسوس ہوا کہ سر سے پاؤں تک اس کا جسم مٹر کی اس پھلی کی طرح تھا جس کے اندر مٹروں کے صاف ستھرے دانوں کی جگہ ایک غلیظ کیڑا پل رہا ہو۔ پارو کو اپنے پورے جسم سے گھن سی محسوس ہونے لگی۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ اپنے پیٹ میں پلتے ہوئے کیڑے کو جھٹک دے، اپنے جسم سے دور کر دے، اس طرح جیسے کوئی ناخنوں سے پکڑ کر چبھے ہوئے کانٹے کو نکال کر پھینک دیتا ہے جس طرح کوئی چمٹے ہوئے گوکھرو کو الگ کر دیتا ہے، جیسے کوئی جمے ہوئے کیچڑ کو اکھیڑ دیتا ہے، جیسے کوئی چمٹی ہوئی جونک کو کھینچ لیتا ہے۔

پارو سامنے کی دیوار کو دیکھنے لگی۔ بیتے ہوئے دن ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔

پارو ضلع گجرات کے چھتووانی گاؤں کے ساہوکاروں کی لڑکی تھی۔

ساہوکار جو عرصے سے ساہوکار نہیں رہے تھے۔ پھر بھی ساہوکار کہلاتے تھے۔ وقت کی گردش سے ساہوکاروں کے گھر کا یہ حال ہو گیا تھا کہ گھر کے بڑے بڑے برتن بھی فروخت ہو گئے تھے۔ وہ برتن جن پر ان کے بزرگوں کے نام کھدے تھے۔ اس جیتی جاگتی ندامت سے بچ کے پارو کا باپ اور چچا گاؤں چھوڑ کر سیام چلے گئے تھے، وہاں ان کے دن بہت جلدی پھر گئے۔ اس وقت پارو دوڑتی بھاگتی تھی۔ اس کی ماں کی گود میں ایک لڑکا تھا۔ پھر ساہوکاروں کا کنبہ اپنے گاؤں (چھتوانی) لوٹ آیا۔ پارو کے باپ نے گروی رکھا ہوا گھر چھڑوایا اور بزرگوں کی لاج بچالی۔ اگرچہ اس کے باپ کو نیا مکان بنانے کے لئے اس سے کم روپے صرف کرنے پڑے تھے۔ اس نے اندھا دھند لگے ہوئے سود کی بھی پروا نہ کی اور دانتوں سے زبان دباتے ہوئے بزرگوں کا نام رکھ لیا۔

فصل اور سب چھوٹی بڑی چیزیں ٹھکانے سے رکھ کر وہ سیام چلے گئے۔ لیکن اب ان کا مکان اور نام گاؤں میں قائم رہا۔ جب وہ دوسری بار گاؤں واپس آئے تو پارو چودہ برس کی تھی۔ اس سے چھوٹا اس کا ایک بھائی تھا اور اس سے چھوٹی اس کی تین بہنیں تھیں۔ جو یکے بعد دیگرے پیدا ہوئی تھیں۔ اور پارو کی ماں چھٹے بچے کی امید کر رہی تھی۔

ساہوکاروں کے کنبے نے گاؤں آتے ہی سب سے پہلا یہ کام کیا کہ قریب کے ایک گاؤں رتووال کے ایک کھاتے پیتے گھرانے میں پارو کے لئے لڑکا دیکھا۔ پارو کی ماں سوچ رہی تھی کہ جب وہ نہا دھو کر فارغ ہو جائے گی تو پارو کے بیاہ کا سلسلہ شروع کرے گی۔ اب کے وہ یہ سوچ کر آئے تھے کہ وہ اس بار سے سبکدوش ہو جائیں گے۔

پارو کی ہونے والی سسرال میں ان دنوں تین بھینسیں دودھ دے رہی

تھیں۔ گاؤں میں اس کی سسرال ہی کا مکان تھا جس پر پکی اینٹوں کا چوبارہ بنا ہوا تھا اور دروازے پر اوم لکھا ہوا تھا۔ لڑکا خوبصورت اور سمجھدار تھا۔ پارو کے باپ نے پانچ روپے اور گڑ کی بھیلی دے کر لڑکے کو پارو کے لئے روک لیا تھا۔ ان دنوں ضلع گجرات میں بدلے کی شادیاں ہوتی تھیں۔ جس لڑکے کے ساتھ پارو کی منگنی ہوئی، اس کی بہن پارو کے بھائی کے ساتھ منسوب ہوئی۔ حالانکہ اس وقت پارو کا بھائی بارہ برس کا تھا اور اس کی منگیتر بالکل چھوٹی۔

دو دو برس کے بعد، تین لڑکیاں پیدا کرنے کے بعد پارو کی ماں تھک چکی تھی۔ اب جب کہ ان کے دن لوٹ آئے تھے اور گھر میں اچھا کھانے پہننے کو تھا، اس کی آرزو تھی کہ ایک لڑکا اور پیدا ہو جائے۔

اب کے پارو کی ماں نے گاؤں آ کر دوسرا کام یہ کیا کہ بدھو ماتا کی پوجا کروائی۔ گاؤں کی کچھ عورتوں نے گھر کے صحن میں گوبر کی ایک گڑیا بنائی۔ کناری لگا کر سرخ اوڑھنی گڑیا کو اوڑھائی۔ دو ماشے سونے کی نتھ بنوا کر گڑیا کی ناک میں ڈال دی اور سب عورتوں نے مل کر گایا۔

بدھ ماتا رُسّی آویں تے منی جاویں

(بدھو ماتا روٹھ کے آنا اور خوش ہو کر جانا)

بدھ ماتا رُسّی آویں تے منی جاویں

ان کے آس پاس کے گاؤں کی عورتوں کا اعتقاد تھا کہ ہر بچے کے جنم لیتے ہوئے خود بدھو ماتا آیا کرتی ہے۔ اگر بدھو ماتا اپنے شوہر سے ہنستے کھیلتے ہوئے ہی چلی آئے تو وہ جلدی سے لڑکی بنا کر چلی جاتی ہے۔ کیونکہ اسے اپنے شوہر کے پاس جلدی پہنچنا ہوتا ہے۔ اگر بدھو ماتا اپنے شوہر سے لڑ جھگڑ کر آئے تو اسے شوہر کے پاس واپس جانے کی جلدی نہیں ہوتی وہ آ کر دیر تک بیٹھتی ہے اور

آرام سے لڑکا بنا دیتی ہے۔ سب عورتوں نے بار بار گانا شروع کیا۔

بدھو ماتا رُستی آویں تے منّی جاویں

(بدھو ماتا روٹھ کے آنا اور خوش ہو کر جانا)

بدھو ماتا شاید کہیں قریب ہی سن رہی تھی۔ اس نے ان کا کہنا مان لیا۔ پندرہویں سولہویں دن پارو کی ماں کے یہاں لڑکا پیدا ہوا۔ ساہوکاروں کے دور اور قریب کے رشتہ داروں کو بھی مبارکبادیں ملنے لگیں۔ فکر کی بات صرف یہ تھی کہ لڑکا تین لڑکیوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ پارو کی ماں کو بہت زیادہ فکر تھی کہ لڑکا کسی طرح زندہ رہے اور ماں باپ کے لئے کسی مصیبت کا باعث نہ ہو۔ بدھو ماتا کو منانے والی عورتیں ایک بار پھر اکٹھی ہوئیں اور کانسی کے ایک بڑے تھال کو بیچ میں سے توڑ کر لڑکے کو تھال کے ٹوٹے ہوئے حصے میں سے گزارا، اور گاتی رہیں۔

ترکھلاں دی دھاڑ آئی (تین لڑکیوں کے بعد لڑکا پیدا ہوا)

تین لڑکیوں کے بعد خیر سے پیدا ہوئے لڑکے کے سب رسوم پورے کرکے سب کو یقین ہو گیا کہ اب لڑکا زندہ رہے گا۔

پندرہواں سال لگتے ہی پارو کے انگ انگ میں ہل چل مچ گئی۔ پچھلے سال کی سب قمیصیں اسے تنگ ہو گئی تھیں۔ قریب کی منڈی سے پارو نے پھولوں والی چھینٹ کی نئی قمیصیں سلوائیں۔ اوڑھنیوں کو بہت سا ابرق لگایا۔ پارو کی سہیلیوں نے اس کے منگیتر رام چندر والے کو دور سے دکھلا دیا تھا۔ پارو کی آنکھوں میں اس کی صورت بس گئی تھی۔ اس کے بارے میں سوچ سوچ کر پارو کا برا حال ہو جاتا تھا۔

پارو بہت کم گھر سے باہر نکلتی تھی۔ قریب کے گاؤں والوں کا اس گاؤں میں بہت آنا جانا تھا، اس کی سسرال کے گاؤں والے اسے دیکھ لیں گے۔ اس بات سے پارو بہت گھبراتی تھی۔ پھر اس گاؤں میں مسلمانوں کی آبادی بھی بہت

بڑھ گئی تھی۔ یوں دن ڈھلے پارو اور اس کی سہیلیاں کھیتوں کی طرف گھوم آیا کرتی تھیں۔ کئی بار اپنے کھیتوں کے قریب سے گزرنے والی پکی سڑک کے پاس پارو رک جاتی۔ کبھی ساگ توڑنے بیٹھ جاتی۔ کبھی کسی بیر کے درخت کے نزدیک ٹھہر جاتی اور بیر توڑتی اور بیر چنتی اور سہیلیوں کو باتوں میں لگائے رکھتی۔ وہ سڑک اس کی ہونے والی سسرال کے گاؤں کو جاتی تھی۔

دل ہی دل میں وہ سوچتی تھی۔ اگر آج اس کا منگیتر یہاں سے گزرے اور وہ اسے گزرتا ہوا دیکھ لے۔ پارو کا دل اس سڑک کے کنارے کھڑے کھڑے دھڑکنے لگتا تھا۔ پھر ساری ساری رات پارو اپنے جوان منگیتر کے خوابوں میں گھری رہتی۔

ایک دن پارو کی نئی جوتی اس کی ایڑی کو لگ رہی تھی۔ سہیلیوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ بار بار پیچھے رہ جاتی تھی۔ پارو اور اس کی سہیلیاں کھیتوں سے گھر واپس جا رہی تھیں۔ شام کا اندھیرا پگھلے سیسے کی طرح پھیل گیا تھا۔ کھیتوں کے کنارے کنارے چلتے ہوئے لڑکیاں گاؤں کی پگڈنڈی پر آ گئی تھیں۔ کبھی وہ پگڈنڈی چوڑی اور خالی زمین پر سے گزرتی تھی اور کبھی درختوں اور جھاڑیوں میں سے ہو کر بڑھتی تھی۔ سب لڑکیاں آگے پیچھے پگڈنڈی پر چل رہی تھیں۔ پارو کچھ پیچھے رہ گئی تھی۔ دائیں پاؤں کی ایڑی کے پاس ایک بڑا چھالہ اُبھر آیا تھا۔ پارو نے پاؤں سے جوتیاں اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیں اور جلدی جلدی قدم بڑھانے لگی۔

لڑکیاں پارو سے کہا کرتی تھیں کہ اس کا دایاں پاؤں بائیں پاؤں سے بھاری ہے۔ اُسے دائیں پاؤں میں نئی جوتی لگتی تھی، اسی طرح پارو کا دایاں بازو بھی بائیں بازو سے بھاری تھا۔ ''پیاری تجھے چوڑیاں پہنتے ہوئے پتہ لگے گا۔''

یہ کہہ کر پارو کو لڑکیاں چھیڑتی تھیں۔ پارو کو خیال آیا، جیسے اسے سچے ہاتھی دانت کی لال چوڑیاں پہنائی جا رہی ہیں۔ پچھلی کھلی کھلی چوڑیاں پہنانے کے بعد آگے کی چھوٹی چوڑیاں پارو کے دائیں بازو میں پھنس گئی ہیں۔ نانی نے تیل سے اس کے انگوٹھے کی ہڈی کو ملا ہے۔ پھر ہاتھی دانت کی لال چوڑی اس کے دائیں بازو میں زور لگا کے چڑھانے لگا ہے۔ پارو کو خیال گزرا اگر یہ ہاتھی دانت کی لال چوڑی اس کے دائیں بازو میں ٹوٹ جائے۔ اس خیال سے پارو کے کلیجے کو دھکا سا لگا۔ ''ہائے...... یہ شگن کتنا برا ہے۔'' اُس کے شگن کی چوڑی، اس کے سہاگ کی چوڑی کیوں اس کے بازو میں ٹوٹے۔ پارو نے اپنے دائیں بازو کو حقارت سے دیکھا۔ پرماتما کرے اس کا منگیتر ہمیشہ زندہ رہے، کئی لاکھ برس زندہ رہے۔ پارو کو یاد آیا کہ ان کے گاؤں میں ایک لڑکی کو چوڑیاں پہناتے ہوئے چوڑی ٹوٹ گئی تھی۔ پاس کھڑی ہوئی عورتیں رام رام کہہ کے پرماتما سے اس کے شوہر کے لئے دعائیں کرنے لگی تھیں۔ پھر سنار سے سونے کی پتلی سی تار، ٹوٹی ہوئی چوڑی میں ڈلوا کر اس لڑکی کو چوڑی پہنائی گئی تھی۔ جیسے انہوں نے اس کے شوہر کی ٹوٹی عمر کو جوڑ دیا تھا۔

پارو ان شگن اور برے شگن کی الجھنوں میں پھنسی ہوئی تھی کہ بائیں طرف کے پیپل کی آڑ میں سے ایک آدمی نکل کر پارو کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پارو کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے گاؤں کا جوان لڑکا رشید اس کے سامنے کھڑا تھا۔ رشید کی عمر بائیں چوبیں برس کی تھی۔ اس کی بھری ہوئی جوانی اس کے چہرے پر جھوم رہی تھی۔ پارو نے دیکھا کہ رشید کی آنکھیں پارو کے چہرے کو گھور گھور کر دیکھ رہی ہیں۔ پارو کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور رشید کا پہلو بچا کر دوڑ پڑی اور دوڑتی دوڑتی دوسری لڑکیوں کے ساتھ جا ملی۔ اب وہ اپنے گھروں کے

سامنے پہنچ گئی تھیں۔ پارو ہانپ رہی تھی۔ یہی شکر تھا کہ رشید نے نہ اسے ہاتھ لگایا نہ اسے کچھ کہا۔

''اری لڑکا تھا یا شیر'' یہ سہیلیوں نے مذاق کیا۔ پھر بھی پارو کی جان میں جان نہیں آ رہی تھی۔ ''اری پگلی شیر تو صرف پھاڑ کر کھا جاتا ہے، کہتے ہیں کہ اگر ریچھ کسی اکیلی عورت کو مل جائے تو اسے مارتا نہیں بلکہ اٹھا کر لے جاتا ہے۔ اپنی گپھا میں لے جا کر اسے اپنی بیوی بنا لیتا ہے۔'' سہیلیوں میں سے ایک سہیلی نے یہ بات سنائی۔

پھر پارو کی جان مٹھی میں آ گئی۔ ''ہائے اس بد بخت کا کیا حال ہوتا ہو گا جس کو ریچھ اپنی بیوی بنا لے۔'' یہ سوچ سوچ کر پارو کا رنگ اڑنے لگا۔ اس کو پھر رشید کی پھٹی پھٹی آنکھیں یاد آنے لگیں۔

اب وہ اپنے گھر پہنچ گئی تھی اور سہیلیاں ہنستی کھیلتی آگے چلی گئیں۔

دوسرے دن جب پارو اور اس کی سہیلیاں کھیتوں میں مونگرے توڑ رہی تھیں تو بہت جلدی سے پارو دو مٹھیاں مونگرے قریب کے چلتے ہوئے کنوئیں سے دھلوائی۔ چھوٹے مونگرے کی ڈنڈیاں توڑ کر پارو نے تین چار مونگرے منہ میں ڈال لئے، جونہی پارو نے دیکھا تو پاس ہی درخت کے قریب رشید کھڑا ہوا تھا۔ پارو کے پاؤں میں سے جیسے کسی نے جان ہی نکال لی ہو، اور اس کے منہ پر ڈر سے ہوائیاں اڑنے لگیں۔

''اجی ڈرتی کیوں ہو، ہم تو آپ ہی کے نوکر ہیں۔'' آج رشید بول پڑا تھا۔ اس کے چہرے سے شرارت ٹپک رہی تھی۔ پارو کو ایسا محسوس ہوا جیسے رشید ابھی ریچھ کے پنجوں سے پنجے لئے ہوئے اس کی جانب پل پڑے گا۔ اس کی لمبی لمبی انگلیاں ریچھ کے ناخنوں کی طرح اس کی گردن کے گرد پھیل جائیں گی۔ پھر وہ اس کو گھسیٹتا ہوا لے جائے گا، اور پھر ...... اور پھر

پارو نے دیکھا کہ سامنے سے دو کسان آ رہے تھے۔ رشید اسی طرح کھڑا ہوا تھا۔ پارو لال لال ٹماٹر کی کیاریوں کو پھلانگ کر جلدی جلدی سہیلیوں سے جا ملی۔

اس دن پارو بہت ہی نڈھال ہوگئی سارا راستہ لڑکیوں کا ہاتھ پکڑے ہوئے چلتی رہی۔ سائے سے بھی کانپ کانپ جاتی۔ معمولی معمولی آہٹ سے بھی تھر تھرا اٹھتی۔

ایک دن پالک کے نرم نرم پتے توڑ کے پارو نے ساگ کاٹا۔ اس کی ماں سُتلی سے بنی ہوئی چوکی پر بیٹھی ہوئی بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ پارو نے ساگ پکانے کے لئے ہانڈی کو بان کے چھوٹے سے گچھے سے مانجھا۔ پھر ساگ کو دو بار پانی سے دھو کر اور اس میں چنے کی دال ڈال کر ہانڈی کو منہ تک بھر دیا۔ چولھے کی مدھم آگ پر دودھ پک رہا تھا۔ پارو نے ساتھ والے چولھے میں دو چار پتلی لکڑیاں لگا کے ساگ پکنے کے لئے رکھ دیا۔

اب پارو کی شادی بالکل نزدیک آ گئی تھی۔ اس کی ماں کو انتظار ہی تھا کہ آج یا کل کوئی آدمی پارو کی سسرال سے کپڑوں کا ناپ لینے کے لئے آ جائے گا۔ پارو کی ماں کہا کرتی تھی کہ پارو کیسی ہوشیار لڑکی ہے۔ کھانا تو وہ آنگن میں اٹھتے بیٹھتے ہی پکا لیا کرتی ہے۔ پارو کی سہیلیاں کہتی تھیں کہ پارو پر جوانی بھی جھوم کر آئی ہے۔ اس کے گورے چہرے پر نظریں نہیں ٹھہرتی تھیں۔ اس کی ماں نے پیار بھری نظروں سے اُسے دیکھا، شاید وہ سوچ رہی تھی کہ اب پارو سسرال چلی جائے گی۔ پارو کا مائکا سونا ہو جائے گا۔ پارو اپنی ماں کا دایاں ہاتھ تھی۔ ماں کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ ہر ایک بیٹی کی ماں کو رونا پڑتا ہے۔ بیٹھی بیٹھی پارو کی ماں گانے لگی۔

لادیں تے لادیں کلیجے نال مایئے — کلیجے سے لگا لے اے ماں
دسیں کے دسیں اک بات نی — اور اک بات بتا
'باتاں تے لمیاں نی دھیاں کیوں جمیاں نی
باتیں تو لمبی ہیں بیٹیاں کیوں پیدا کیں
اج دچھوڑے والی بات نی — آج جدائی کی رات ہے

پارو کی ماں کے پیار سے آنسو نکل پڑے۔ پارو رسوئی کے چھوٹے چھوٹے کام کرتے ہوئے ماں کی آواز سن رہی تھی۔ اس کو جدائی کے اندیشوں نے گھیر لیا۔

پارو دوڑتی دوڑتی آئی اور ماں کے گھٹنوں سے لگ گئی۔ ماں اور بیٹی دونوں رو پڑیں۔ جوانی بیٹی کو ماں سے جدا کر دیتی ہے، پارو کی ماں نے حوصلہ دیا اور بیٹی کی پیٹھ پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ شام کا اندھیرا ان کے صحن میں بھی پھیل گیا تھا۔ پارو کی ماں کو یاد آ گیا کہ آج دوسری کوئی چیز پکانے کے لئے گھر میں کچھ نہیں ہے، شاید پارو کی سسرال سے کوئی آدمی آ جائے۔ پارو کی ماں نے پارو سے کہا ''چھوٹی بہن کو ساتھ لے جا اور قریب کے کھیت سے کچھ بھنڈیاں توڑ لا۔ اور ہاں تھوڑے سے چاول اور گڑ لے کر میٹھے چاول بھی پکا لے۔''

پارو کا دل آج گھبرا گھبرا اٹھتا تھا۔ اس نے اپنی چھوٹی بہن کو ساتھ لیا اور باہر چل پڑی۔ پارو نے بھنڈیاں توڑیں اور دو چار مونگرے توڑ کر واپس مڑ گئی، جاتے وقت پارو کو صرف یہی خیال آتا رہا کہ اب وہ اپنی ماں سے بچھڑ جائے گی۔ اپنی بہنوں سے دور ہو جائے گی۔ اپنے ننھے بھائی سے جدا ہو جائے گی۔ آتے ہوئے پارو کو خیال آیا کہ یہاں کہیں رشید نہ مل جائے۔

پارو تیز قدموں سے چلنے لگی۔ ''پارو دوڑتی کیوں ہے۔'' پارو کی چھوٹی

بہن کو سانس چڑھ گیا تھا۔ پارو کے پیچھے سے دوڑتی ہوئی ایک گھوڑی آئی۔ پارو ابھی پگڈنڈی سے ہٹنے بھی نہ پائی تھی کہ پتہ نہیں گھوڑی یا گھوڑی سوار اس کے دائیں کاندھے سے ٹکرایا۔ پارو بالکل گرنے ہی لگی تھی کہ کسی نے پارو کو کھینچ کر گھوڑی پر ڈال لیا۔ پارو کی چیخیں دوڑتی ہوئی گھوڑی کے ساتھ لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی گئیں۔ پارو کی بہن کانپتی کی کانپتی ہی رہ گئی۔

وہ گھوڑی کہاں سے آئی تھی اور اس کا سوار کون تھا۔ گھوڑی کتنی دیر دوڑتی رہی، پارو کو کچھ پتہ نہیں چلا۔ وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔ جب ہوش آیا تھا تو اس کو معلوم ہوا کہ وہ چار دیواروں اور بند دروازے میں ایک چارپائی پر پڑی ہوئی ہے۔ پارو کو سب کچھ یاد آ گیا۔ اُس نے دیواروں سے اور دروازے سے سر ٹکرایا اور تھک ہار کر چارپائی پر گر پڑی۔ اور پھر بے ہوش ہوگئی۔

جب پارو کو ہوش آیا تو اس کے سر میں کوئی گرم گرم گھی مل رہا تھا۔ پارو کو ایک بار تو یہ خیال آیا کہ شاید اس کی ماں سرہانے بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کو بہت تیز اور نہایت شدید بخار چڑھا ہوا تھا۔

''ماں!'' پارو نے منہ سے آواز نکلی۔

''میرا قصور معاف کر دے اور ایک بار ہوش میں آ جا پارو!'' کسی نے سرہانے کی طرف سے کہا۔ بخار سے کراہتی ہوئی پارو نے سر اٹھا کر دیکھا۔ رشید اس کے سرہانے بیٹھا ہوا تھا۔ پارو کے منہ سے چیخ نکلی اور اسے غش آ گیا۔

پارو نے دیکھا کہ کالے بالوں والا ایک ریچھ اس کے بالوں میں اپنے پنجے پھیر رہا ہے اور وہ ایک گپھا میں بند ہے۔ پارو سمٹتی جا رہی ہے۔ ریچھ بڑھتا رہا ہے۔ ریچھ نے اپنے بالوں والے بازوؤں میں پارو کو سمیٹ لیا ہے۔ پارو نے آنکھیں پھاڑ کے دیکھا۔ کوئی اس کے پاؤں کے تلوے مل رہا ہے۔ پھر کسی نے

اسے کاندھے سے پکڑا ہے۔ پھر کسی نے پانی کے چلو اس کے منہ میں ڈالے۔ ریچھ کی گپھا یا رشید کا گھر پارو کے سر کو چکر آ رہے تھے۔ پھر شاید پارو سو گئی۔

پارو کو اپنی ماں اپنا گاؤں اور اپنا سب کچھ ہی یاد تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس گپھا میں پڑے پڑے اسے کئی برس ہو گئے ہیں۔ رشید کی شکل دیکھنے کی اسے عادت ہوگئی تھی، نہ رشید نے کبھی اسے کچھ کہا تھا نہ اس نے کبھی رشید کو بلایا تھا۔ سوئی ہوئی پارو کے منہ میں رشید نرم گھی اور گرم تیز چیز ڈالتا تھا۔ کبھی کچھ پارو کے منہ میں چلا جاتا تھا، کبھی پارو تھوک دیتی تھی۔

پھر پارو نے ہمت کر کے دیوار کے ساتھ پیٹھ لگائی اور پھر چارپائی پر بیٹھ گئی۔

''میں کہاں ہوں۔'' پارو نے پوچھا۔

''میرے پاس۔'' رشید چارپائی کے سامنے اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔ رشید کا چہرہ جھکا ہوا تھا۔ آج رشید اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے نہیں دیکھ رہا تھا۔

''تو مجھے یہاں کیوں لایا ہے۔'' پارو کو پوچھنے کا حوصلہ ہوا۔

''پھر کسی وقت بتاؤں گا۔'' رشید نے کہا اور پھر اٹھ کر باہر چلا گیا، اور پارو چارپائی پر گم سم لیٹ گئی۔

کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ پارو نے دیکھا باہر صحن ہے۔ صحن کے ساتھ ایک چھوٹی سی ڈیوڑھی ہے اس کے بعد باہر کا دروازہ۔ پارو کانپتی ہوئی اٹھی۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اس کو ڈر تھا کہ دیواروں میں سے ابھی کوئی آدمی نکل آئے گا۔ پارو کو بازو سے پکڑ کے چارپائی پر ڈال دے گا، لیکن دیواروں میں سے کوئی آدمی نہ نکلا۔ پارو صحن میں آ گئی۔ صحن کے ایک کونے میں چولھے میں بجھی ہوئی کچھ لکڑیاں تھیں۔ نزدیک ہی ہانڈی توا اور پرات بکھرے پڑے تھے۔ پانی کی مٹکی بھری ہوئی ایک کونے میں رکھی ہوئی تھی۔ لیکن کوئی آدمی

کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ پارو کانپتے ہوئے قدموں سے ڈیوڑھی میں آئی اور باہر والے دروازے کے قریب پہنچی۔ پھر مڑ کر کوٹھری کی طرف دیکھا۔ لیکن دروازہ پارو کی قسمت کی طرح بند تھا۔ پارو نے بند دروازے سے سر ٹکرایا لیکن دروازے کو پارو کے جھکتے ہوئے سر پر ترس آیا نہ اوندھے منہ پر، نہ تو آنکھوں پر۔ آنچل سے منہ پونچھ کر پارو دروازے سے لوٹ آئی۔ مٹکی میں سے چلو میں پانی لے کر آنکھوں پر ڈالا۔ پھر پارو کو خیال آیا کہ وہ دروازے کو زور سے کھٹکھٹا کر دیکھے، شاید کوئی اڑوسی پڑوسی کھول دے یا کوئی گزرنے والا اس کی آواز سن لے۔ پارو نے صحن کی اونچی اونچی دیواروں کی طرف دیکھا۔ پھر ایک بار پوری طاقت سے دروازے کو کھٹکھٹایا۔ پارو نے دروازے کی درزوں میں سے دیکھا، باہر کھلا میدان تھا۔ کوئی مکان یا جھونپڑی نظر نہیں آتی تھی۔ پارو سوچ سوچ کر رہ گئی پتہ نہیں وہ کون سے جنگل میں ہے۔

پارو دروازے کے پاس ہی کھڑی ہوئی تھی کہ دروازہ باہر سے کھلا۔ رشید نے اندر آ کر دروازہ پھر بند کر دیا اور تالا لگا دیا۔ پارو وہیں کی وہیں بیٹھ گئی۔

"پارو، کیوں ٹکریں مار رہی ہے۔ اندر چل، کچھ کھا لے، تو نے دو دن سے کچھ نہیں کھایا۔" رشید نے کھڑے ہی کھڑے کہا۔ اس نے نہ پارو کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور نہ اس کی طرف گھورتے ہوئے دیکھا۔

"مجھ پر ترس کھا رشید، مجھے گھر چھوڑ آ۔" پارو اس کے پاؤں پر گر پڑی۔

اب کے رشید نے اپنے لاٹھی کی طرح مضبوط بازوؤں میں پارو کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

"میرے دل کی آگ کون بجھائے گا؟" رشید نے ہاتھ پاؤں مارتی ہوئی پارو کو اپنے بازوؤں میں اٹھائے رکھا۔

وہ دن بھی گزر گیا۔ وہ رات بھی گزر گئی۔ پھر رشید نے اس کو کچھ نہیں کہا۔ دروازہ اسی طرح بند تھا اور رشید بھی ویسے ہی پہرے پر تھا۔ رشید اس گھر سے باہر بھی جاتا تھا اور گھنٹے دو گھنٹے باہر رہ آتا تھا۔ پارو قید رہتی تھی۔ پھر صبح و شام کے گہرے اندھیروں میں رشید پارو کا ہاتھ پکڑ کے اس کو باہر لے جانے لگا۔ پارو نے دیکھا کہ اس گھر کے سوا آس پاس دکھائی دیتے ہوئے میدان میں کوئی گھر نہیں ہے۔ رشید کے اس مکان کے اردگرد بہت بڑا باغ پھیلا ہوا تھا۔ یہ گھر شاید باغ کے مالیوں کے لئے تھا۔ باغ میں مالی ہوں گے۔ لیکن پارو نے کبھی کوئی آواز نہ سنی تھی اور نہ کبھی کوئی آدمی دیکھا تھا۔ نہ پارو کے دن گزرتے نہ پارو کی راتیں ختم ہوتیں اور وہ اس پر شکر کرتی تھی کہ رشید نے اسے کبھی بری بھلی نہیں کہی تھی۔ پارو کی عزت ابھی تک قائم تھی۔ یہ اور بات ہے کہ رشید پر پارو کی منتوں کا اثر ہوتا تھا نہ گالیوں کا۔ پارو کو اپنے خیال کے مطابق قید ہوئے پندرہ دن ہو گئے تھے۔

ایک دن رشید نے لال ریشم کا سوٹ لا کر پارو کے سامنے رکھ دیا۔ اس سے پہلے بھی پارو کے لئے دو سوتی جوڑے لایا تھا۔ لیکن اب کے پارو کے سامنے لال ریشم کا سوٹ رکھتے ہوئے رشید نے کہا۔ "صبح نہا دھو کر تیار ہو جانا۔ مولوی آ کر ہمارا نکاح پڑھا دے گا۔"

پارو کا دل دھک سے رہ گیا۔ بدبختی جو اب تک نہیں ہوئی وہ ہو کر رہے گی، اس دن پارو پھر رشید کے پاؤں پر گر پڑی۔

"پارو ہونا کچھ بھی نہیں۔ یونہی میرے سر پر گناہوں کا بوجھ مت بڑھا۔ قسم ہے اللہ پاک کی۔ مجھ سے تیرا رونا نہیں دیکھا جاتا۔" رشید نے منہ پھیر کر کہا۔

پارو کی سمجھ نہ آیا کہ اگر رشید اس پر اتنا ہی مہربان تھا تو اس پر اتنا بڑا ظلم کیوں ڈھایا۔

"تجھے اپنے اللہ کی قسم ہے، رشید! مجھے سچ سچ بتا کہ تو نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟"

"پارو تیرا میرا رشتہ کچھ پہلے جنم ہی کے لینے دینے کا ہے۔ اب تجھے ان باتوں سے کیا لینا ہے جو ہونا تھا ہو گیا۔ میں تجھے ساری عمر کوئی تکلیف نہ ہونے دوں گا۔"

پارو حیران و پریشان تھی کہ یہ کیسا آدمی ہے۔

"پارو ہمارے شیخ گھرانے میں اور تمہارے ساہوکار گھرانے میں ہمارے دادے کے وقت سے ایک بیر چلا آ رہا ہے۔ تیرے دادے نے پانچ سو میں گروی رکھے ہوئے ہمارے مکان پر سود در سود لگایا تھا۔ پھر قرقی کروا کے ہمارے گھرانے کو بے گھر کیا تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں۔ اس کے منشی اور کارندے نے ہمارے گھر کی عورتوں کو بہت برا بھلا کہا تھا۔ اور میرے دادے کی بڑی بیٹی کو تیرے دادے کے بڑے بیٹے نے زبردستی تین راتوں تک اپنے گھر میں رکھا تھا۔ تیرے دادے کی آنکھوں کے سامنے اتنا بڑا ظلم ہوا۔ لیکن اس وقت شیخ گھرانا گنے کی طرح نچڑا ہوا تھا۔ سب خون کے آنسو پی کر رہ گئے۔ میرے دادے نے میرے باپ چچا اور تاؤ کو قرآن اٹھوا کر قسمیں دی تھیں کہ وہ اس کا بدلہ لے کر رہیں گے۔ اس سے اگلی نسل بات دب کر رہ گئی۔ اب جب تیری شادی اس گاؤں میں ہونے لگی۔ میرے چچے اور تاؤ کے دل میں پرانا انتقامی جذبہ جاگ اٹھا۔ انہوں نے مجھے قسمیں دیں اور میرے خون میں جوش پیدا کر دیا۔ مجھ سے قول لیا کہ ساہوکار کی بیٹی کو شادی سے پہلے کسی دن بھی اٹھا کر لے جاؤں گا۔"

رشید چپ ہو گیا۔ پارو صبر سے اپنی ہونی کی کہانی سنتی رہی۔

"پارو پہلے ہی دن جب میں نے تجھے دیکھا۔ خدا گواہ ہے۔ مجھے تجھ

سے عشق ہو گیا تھا۔ ایک تو میری محبت کا جوش اور دوسرے میری حمایت پر سارا شیخ گھرانا۔ میں تجھے لے آیا۔ لیکن مجھ سے قسم لے لے، مجھ سے تیرا دکھ نہیں دیکھا جاتا۔" رشید نے پھر کہا۔

پارو نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ "تیری بوا کو میرے تاؤ نے اٹھا لیا۔ لیکن رشید! اس میں میرا کیا قصور ہے۔ ہائے میں تو کہیں کی بھی نہ رہی۔" پارو کا منھ آنسوؤں سے بھیگ گیا۔

"یہی تو میں کہتا تھا۔ لیکن میرے چاچے مجھے ملامت کرتے تھے۔"

"تو رشید! تو نے ان کے کہنے میں آ کر مجھے مار ڈالا ہے۔" پارو نے روتے روتے کہا۔

"پارو میں ساری عمر تیرے سامنے دنیا کی نعمتیں لا لا کر رکھوں گا۔" رشید نے کہا۔ اس کا گلا بھر آیا تھا۔

"میں تیرے تاؤ جیسا نہیں کروں گا کہ تین راتوں کے بعد اپنی بنائی ہوئی بیوی کو دھکا دے دوں۔"

"رشید ایک بار مجھے ماں سے ملا دے۔" پارو کو کہنے کے لئے یہی بات سوجھی۔

"نیک بخت! اب اس گھر میں تیری جگہ نہیں۔ ان کی برادری کا کون ساہندو پھر ساہوکاروں کے گھر کا پانی پئے گا۔ تو میرے گھر میں پورے پندرہ دن رہ چکی ہے۔"

"لیکن میں نے تیرے گھر صرف کھایا پیا ہے۔ میں......" پارو اور کچھ نہ کہہ سکی۔ لیکن رشید سمجھ گیا جو پارو کہنا چاہتی تھی۔

"اس بات کو کون مانے گا، پارو! یہ تو میری شرافت ہے کہ میں پہلے تجھ سے نکاح پڑھواؤں گا......" رشید نے نرم نگاہوں سے پارو کی طرف دیکھا۔

پارو کے خیال میں اس کا منگیتر آ گیا۔ پارو کو تیل چڑھنا تھا۔ اس کو مائیوں بیٹھنا تھا۔ اس کے ہلدی والا ابٹن ملا جانا تھا۔ اس کے سچے ہاتھی دانت کا چوڑا چڑھنا تھا۔ اسے سچے ریشمی سوٹ پہننے تھے۔ اس پر روپ چڑھنا تھا۔ اسے ڈولی میں بیٹھنا تھا۔ پارو...... پارو...... پارو......

پارو بے گناہ تھی۔ وہ مان نہیں سکتی تھی کہ اس کی ماں کا دل پتھر ہو جائے گا اور باپ کا دل لوہا بن جائے گا۔ وہ کیسے اپنی بیٹی کو اپنے گھر سے دھتکار دیں گے۔ کس طرح گھر کی دیواریں اسے گھر میں رکھنے سے انکار کر دیں گی۔ ''میرے ماں باپ کا کیا حال ہوا ہوگا۔ جب میں گھر نہیں پہنچی ہوں گی۔ میری بہن......'' پارو کو وہ وقت یاد آ گیا جب ہونی اس کے سر پر ٹوٹ پڑی تھی۔

''وہ روتے رہتے ہیں، جیسے میرا دادا میرا باپ اور میرا چاچا میری پھوپھی کے چلے جانے کے بعد روتے رہے تھے۔ پولس نے بہت تلاش کیا لیکن انہیں بھی کوئی سراغ نہ مل سکا۔ سراغ مل بھی کیسے سکتا تھا۔ پولس نے پورا پانچ سو روپے کھایا ہے۔'' رشید مسکرا پڑا۔ ''تو جانتی ہے کہ اس وقت ہمارا پلڑا بھاری ہے۔ گاؤں میں مسلمانوں کا زور ہے۔ کوئی ہندو ہماری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ اتنا بہت ہے کہ ان کی جان اور مال سلامت ہے۔ انہیں اپنی جان کی ضرورت ہے۔ وہ کچھ بول نہیں سکتے۔ اگر وہ ہمارے گھر کی طرف انگلی بھی اٹھا دیتے تو ہمارے آدمی انہیں نالہ تک پار نہ کرنے دیتے۔'' رشید نے کچھ ہنس کر کہا۔ شاید اس کے اندر پرانے بدلے کی آگ جاگ اٹھی تھی۔

پارو کو رشید سے شدید نفرت پیدا ہو گئی۔ اس کا جسم گیا اور اس کا جیون گیا۔ اس کے ماں باپ چھتووانی (گاؤں) کو اپنی بیٹی کی قربانی دے کر سیام واپس چلے گئے ہوں گے۔ ''میرے ماں باپ سیام چلے گئے ہیں؟'' پارو نے

سسکی بھرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں ابھی نہیں۔'' رشید نے بتایا۔

''میں کہاں رہتی ہوں؟ اپنے گاؤں سے کتنی دور۔'' پارو نے پھر پوچھا۔

''تو اپنے گاؤں کی پچھلی طرف 'ما گوئے' گاؤں سے اس پار۔ میرے اپنے باغ میں۔ شاید تو اپنے گاؤں جانے کا خواب دیکھ رہی ہوگی۔ ابھی نہیں، ذرا معاملہ دب جائے، چھ مہینے ٹھہر کر وہاں بھی لے چلوں گا۔'' رشید پھر مسکرایا۔

پارو چپ ہو گئی، رشید نے میٹھے چاولوں کے پلاؤ کی ایک طشتری پارو کے سامنے لا رکھی۔ رشید جب باہر جاتا تھا تو شاید اپنے گاؤں سے کسی کے ہاتھ کھانا منگوایا کرتا تھا۔ پارو کو کچھ بھی پتہ نہیں تھا۔

اس دن پارو کے دل میں کوئی ارادہ ابھر رہا تھا۔ اس کی ہمت اسے جواب نہ دے جائے۔ اس لئے پارو نے چاولوں کے دو چار لقمے نگل لئے۔ پانی بھی گھونٹ گھونٹ کر کے پورا کٹورا پی لیا۔

اس رات پارو نے پوری کوشش سے اپنے دل کو مضبوط کیا۔ رشید کے سرہانے دروازے کی چابی پڑی ہوئی تھی۔ پارو نے آہستہ سے اٹھائی۔ دروازہ کھولا۔ اس کا کلیجہ دھڑک رہا تھا کہ رشید اب جاگا کہ تب جاگا۔ لیکن پارو کی خوش قسمتی یا بدقسمتی۔ رشید نہیں جاگا۔

باہر رات کے سناٹے کو دیکھ کر پارو کانپ کانپ گئی۔ ایک بار پارو کا جی چاہا کہ وہ رشید کے پاس واپس چلی جائے۔ پتہ نہیں کہ وہ رات کے اندھیرے میں چھتووانی کا راستہ بھی ڈھونڈ سکے گی یا نہیں۔ یا شاید وہ رات کے اندھیرے میں رشید سے بھی گئے گزرے کسی آدمی کے ہاتھ میں پڑ جائے۔ پھر پتہ نہیں کہ اس کا کیا حال ہوگا۔ لیکن اس کو ماں یاد آئی۔ باپ کا خیال آیا۔ اس کو بہن

اور بھائی یاد آئے۔ پارو یونہی ماگوئے گاؤں کی سمت کا اندازہ کر کے ڈرتی اور کانپتی ہوئی چل پڑی۔

رات کا گہرا اندھیرا چھٹ گیا، ماگوئے گاؤں کی سمت درست تھی۔ پارو نے اندھیرے ہی اندھیرے میں چھتووانی (گاؤں) کا پچھواڑہ پہچان لیا۔ اب وہ نہ ادھر کی تھی نہ ادھر کی۔ پارو نے رہی سہی طاقت کو اکٹھا کیا۔ اور وہ دوڑ پڑی۔ اس نے چھتووانی گاؤں کو پہچانا۔ اپنے گھر کی طرف مڑتی ہوئی گلی کو پہچانا۔ ہلکے اندھیرے میں اپنے گھر کی دیواروں کو پہچانا۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ جونہی کسی نے اندر سے دروازہ کھولا وہ ڈیوڑھی کے فرش پر گر پڑی۔ اس نے اپنی طاقت کا آخری حصہ بھی صرف کر دیا تھا۔ وہ دوڑ دوڑ کر اور ہانپ ہانپ کر منزل پر پہنچ ہی گئی تھی۔ اب اس کی سب طاقت ختم ہو گئی تھی۔

پارو کی آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کی ماں اور اس کا باپ ہاتھ میں دیا لے کر اس کے پاس کھڑے ہیں۔ وہ ایک زخمی پرندے کی طرح فرش پر سسکنے لگی۔ اس نے دیکھا کہ اس کی ماں کی آنکھوں سے آنسوؤں تانتا بندھ گیا ہے۔ ماں نے فرش پر پڑی ہوئی پارو کو اپنی باہوں میں لے لیا۔ اس نے ماں کی چھاتی سے اس طرح چپکی جیسے ٹوٹی ہوئی آنتیں دوبارہ جڑ جائیں گی۔ پھر پارو کی ماں کی چیخیں نکل گئیں۔

''لوگ ابھی اکٹھے ہو جائیں گے'' پارو کے باپ نے اپنی بیوی کو کاندھے سے پکڑ کر ہلایا۔ پارو کی ماں نے آنچل کے ایک سرے کو اٹھا کر کے منہ میں ٹھونس لیا۔

''بیٹی تیری قسمت، اب ہماری بس میں کچھ نہیں۔'' پارو کو اپنے باپ کی آواز آئی۔ پارو اپنی ماں سے چمٹی رہی۔ ''ابھی شیخ گھرانے کے آدمی آ جائیں

گے تو ہمارے پورے کنبے کو ختم کر دیں گے۔''

''مجھے ساتھ لے کر سیام چلے چلو'' پارو نے ماں کی چھاتی سے منہ ہٹا کر پورے زور سے کہا۔

''ہم تمہیں کہاں رکھیں گے، اب تجھ سے کون شادی کرے گا۔ تیرا دھرم گیا اور تیرا جنم گیا۔ اگر ہم ذرا بھی آواز نکالیں تو یہاں ہمارے خون کے ایک قطرے کا پتہ بھی نہ چلے گا۔''

''تو مجھے اپنے ہاتھوں سے مار ڈالو۔'' پارو نے تڑپ کر کہا۔

''بیٹی پیدا ہوتے ہی مر جاتی، اب یہاں سے چلی جا۔ ابھی شیخ آتے ہوں گے۔ تیرے باپ اور بھائی کا کہیں بھی نشان نہیں ملے گا۔'' ماں نے پتہ نہیں کیسا پتھر دل پر رکھ کر کہا۔

پارو کو یاد آیا کہ رشید کہہ رہا تھا۔ نیک بخت اس گھر میں تیری کوئی جگہ نہیں۔ کیا رشید سچ کہہ رہا تھا، پارو کو ایک بار اپنے منگیتر رام چند کا خیال آیا۔ منگنی کیا اور شادی کیا۔ کیا پارو اس کی کچھ بھی نہ لگتی تھی۔ اس نے پارو کی بات بھی نہ پوچھی۔ پھر اس کا زندہ رہنے کو دل نہ چاہا۔ پارو نے سوچا اور تو سب راستے بند ہیں۔ شاید موت کا راستہ کھلا ہو۔ وہ اُٹھ کر باہر چل پڑی۔ نہ ماں نے پکڑا نہ باپ نے۔ پارو چلی گئی۔ آتے ہوئے پارو زندگی سے ملنے کے لئے آ رہی تھی۔ اس میں زندہ رہنے کی امنگ تھی۔ ماں باپ سے ملنے کی امنگ۔ وہ بہت ڈرتی ہوئی آئی تھی۔ واپس جاتے وقت وہ موت سے ملنے جا رہی تھی۔ اب پارو کے دل میں کوئی خوف نہیں تھا۔ موت سے زیادہ کوئی کیا کرے گا۔

پارو بے [illegible] ہوئے گاؤں کی طرف جا رہی تھی۔ صبح کا نیا اجالا سب راستوں پر پھیلا ہوا تھا۔ سامنے سے رشید بے تحاشا بھاگا آ رہا تھا۔ موت

نے بھی پارو پر اپنا دروازہ بند کر دیا۔ پارو کو محسوس ہوا کہ اس کے جسم کو ان پندرہ دنوں نے پنجر بنا دیا ہے جس کی نہ کوئی شکل ہے، نہ کوئی صورت، نہ کوئی دل ہے، نہ کوئی مرضی...... رشید نے آ کر پارو کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چل پڑی۔

اس کے تیسرے دن ایک مولوی آیا اور دو تین آدمی اس کے ساتھ آئے۔ انہوں نے رشید کے ساتھ پارو کا نکاح پڑھوا دیا۔ پھر خود ہی رشید نے پارو کو بتایا کہ اس کے ماں باپ خیریت سے سیام واپس چلے گئے۔

چھتووانی کا نام لیتے ہوئے بھی پارو کو چکر آتے تھے۔ رشید بھی اس بات کو سمجھتا تھا، پھر چھتووانی میں پارو کو لے جانا بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ شاید رشید سوچتا تھا کہ وہاں کے یا ساتھ والے گاؤں کے ہندو جوش میں نہ آ جائیں۔ حالانکہ اس واقعے کو ایک مہینہ پورا ہونے والا تھا، لیکن جرأت نہ ہوتی تھی کسی کو کچھ بولنے کی۔ پھر پرانی آگ میں کون کودتا ہے۔ ان میں پشتوں سے دشمنی تھی۔ کسی نے دشمنی ڈالی اور کسی نے بدلہ لیا۔ رشید کی کوئی بہن یا ماں بھی تو زندہ نہیں تھی۔ بھائی تھے، چاچے تھے۔ رشید نے پارو سے کہا کہ وہ اس کو کوسوں دور ایک گاؤں سکھی ہے۔ وہیں دادے پوتے کے رشتے کے ایک بھائی رحیم کی زمین پر لے جائے گا۔ شاید اس کی زمین سے اپنی زمین بھی بدل لے۔

اب پارو ہوئی ہر ایک دھکے کے لئے تیار تھی۔ ماں باپ کے گھر سے دھکیلی گئی۔ اب گاؤں میں پڑا رہنا تھا۔ یہاں نہ سہی وہاں نہ سہی۔

رشید خود ہی گھر کے بڑے کی طرح دو تین ٹرنک لے آیا اور کچھ چھوٹی موٹی چیزیں بھی۔ اور پارو کو ساتھ لے کر سکھری لے چل پڑا۔ راستے میں جیسے کوئی آنکھیں بند کئے ہوئے چلتا ہے۔ اسی طرح پارو رشید کے ساتھ ساتھ نئے گاؤں

میں آ گئی۔ نئے گاؤں میں پہنچتے ہی رشید اور پارو کو الگ گھر مل گیا۔ شاید رشید نے پہلے ہی رحیم سے کہہ سن کر یہ طے کر لیا تھا۔ رحیم کا گھر ان سے کافی دور تھا لیکن جب رحیم کے گھر کی عورتیں اس سے ملنے کے لئے آئیں، تب پہلا موقع تھا کہ پارو کو رشید کی رشتہ دار عورتوں سے واسطہ پڑا۔

پارو ایک کھوئی ہوئی بچھیا کی طرح ان کے پاس بیٹھی رہی۔ ان نیک عورتوں نے پارو سے زیادہ پوچھ گچھ نہیں کی۔ صرف چھوٹی موٹی باتیں پوچھتی رہیں اور گھر کی ضرورتیں دریافت کرتی رہیں۔

رشید اس وقت تک پارو کو پارو ہی کہتا تھا۔ نکاح کے وقت رکھا ہوا نام حمیدہ ابھی اس کی زبان پر اچھی طرح نہیں چڑھا تھا۔

ایک دن اچانک رشید ایک آدمی کو گھر لے آیا۔ وہ بانہہ پر عورتوں اور مردوں کے نام گودتا تھا۔ پارو کے کلیجے میں پھر ہوک اٹھی۔ جیسے رشید نے کہا، اس نے بانہہ آگے کر دی۔ اس کی بائیں بانہہ پر ''حمیدہ'' گہرے ہرے رنگ میں گودا گیا۔ رشید بھی اس دن سے اس کو حمیدہ کہنے لگا۔

یہ مشورہ شاید رحیم نے دیا تھا۔

پارو اب حمیدہ بن گئی تھی۔ لیکن اب بھی جب وہ رات کو سوتی اسے خواب میں سہیلیاں ملتیں۔ وہ سپنوں میں ماں باپ کے گھر کھیلتی کودتی، سب ہی اسے پارو پکارتے تھے۔ پارو دن کی روشنی میں حمیدہ بن جاتی تھی اور رات کے اندھیرے میں پارو ہوتی تھی۔ لیکن وہ سوچتی تھی کہ وہ اصل میں حمیدہ ہے نہ پارو...... وہ صرف ایک ڈھانچہ ہے۔ جس کا نہ کوئی روپ ہے نہ کوئی نام ہے۔

پانچ چھ مہینے ہی گزرے تھے کہ پارو کے پنجر میں ایک چھوٹی سی جان دھڑکنے لگی۔

سرمئی دن تھا۔ بیتے ہوئے دن ایک ایک کر کے پارو کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے۔ بوری کے ایک ٹکڑے کو پاؤں کے نیچے دبائے ہوئے پارو پتھر کی بنی ہوئی انھیں آنکھوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھتی رہی۔

باہر والا دروازہ کھول کے رشید صحن میں آ کر کھڑا ہو گیا پارو نے جیسے دروازہ زور سے کھلنے کی آواز بھی نہ سنی ہو۔ پارو نے جیسے کوئی اندر آتے ہوئے بھی نہ دیکھا ہو۔ وہ اس طرح بیٹھی رہی شاید رشید کو اس سے سچ مچ پیار تھا۔ رشید چپ چاپ آ کر اسی کے قریب بیٹھ گیا۔

''کیا سوچ رہی ہے۔'' رشید نے پارو کو بازوؤں میں لے لیا۔ وہ آج بہت اداس تھی، نہ ہل سکی نہ بول سکی۔ رشید اس سے لاڈ پیار کرتا رہا۔ پھر کتنی ہی دیر کے بعد اس نے کہا۔

''آج یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی میری آنتوں کو کاٹ رہا ہے۔''

رشید ہنستا رہا۔ پارو کا دل بہلاتا رہا۔ پھر رشید نے چولھے میں بجھی ہوئی آگ سلگائی۔ پارو کو پاس بٹھا کر آپ پتیلے میں بٹیریں بھوننے لگا۔

''نہ تو تو گھر سے باہر نکلتی ہے، نہ کسی سے ملتی ہے۔ اس طرح تو آدمی کا دل خواہ مخواہ اداس ہو جاتا ہے۔'' رشید نے کچھ دیر کے بعد کہا۔

''کہاں جاؤں اور میرا ٹھکانہ ہی کہاں ہے۔'' پارو نے بجھے ہوئے دل سے کہا۔

''اب تو گھر کی مالک ہے اور چار دن میں تیرے صحن میں ایک بچہ کھیلنے لگ جائے گا۔ میرے لئے نہ سہی، اس کے لئے ہی تجھے اداس نہ ہونا چاہئے۔

اس بے چارے نے تیرا کیا بگاڑا ہے۔''

رشید کو اپنے ہونے والے بچے کا خیال آیا۔ اس نے پارو کو اسی کا واسطہ دیا۔ پارو کو پھر مٹر میں سے نکلا ہوا کیڑا یاد آ گیا۔ جس کیڑے کو دیکھ کر کسی کا دل متلا جائے۔ جس کیڑے کے ساتھ لگے ہوئے مٹر کو بھی کوئی پھینک دے۔

''لے آ؟ بٹیروں کے ساتھ تھوڑے سے مٹر بھی ڈال دوں'' رشید نے پارو کے سامنے بکھرے ہوئے مٹروں کو دیکھ کر کہا۔

مٹر تو سب پکے ہوئے ہیں۔ مٹروں کا کونسا موسم ہے، بیساکھ شروع ہونے لگا ہے، پارو کو معلوم تھا کہ آج اس سے مٹر کھائے نہیں جائیں گے۔

'ہاں، سچ! کل تو بیساکھی کا میلہ لگے گا۔'' رشید کو یاد آیا۔

بیساکھی .... بیساکھی .... پارو کے کانوں میں گونجنے لگا۔ وہ پرات میں دو تین مٹھیاں آٹا ڈال کر گوندھنے لگی، تاکہ اس کا خیال کسی اور طرف لگ جائے۔

''آج تو میرا دل چاہتا ہے کہ گڑ ڈال کر سویاں بنائی جائیں۔'' رشید نے کہا۔

پارو چپ چاپ اندر سے سویاں اور گڑ لے آئی۔ اس وقت پارو کو یاد آیا کہ بہت دنوں کی بات ہے کہ ایک دن اس کی ماں بیٹھی سوجی کی سویاں توڑ رہی تھی تو پارو نے کہا تھا کہ میرا تو مشین کی سویاں کھانے کو جی چاہتا ہے۔ اس پر ماں نے کہا تھا ارے پگلی وہ تو مسلمان کھاتے ہیں۔ یہ بات یاد آتے ہی پہلے تو پارو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے پھر وہ ہنس پڑی۔ رشید اس کے ہنسنے کی وجہ پوچھتا رہا۔ پارو نے وہ بات بتا دی۔ وہ بات سناتے سناتے پارو رو پڑی۔ رشید گھبرایا ہوا ہنستا رہا۔

جب تک پارو [illegible] تو گاؤں میں بیساکھی کے ڈھول بج رہے تھے۔ پہلے تو وہ کام کاج میں لگی رہی۔ پھر چھت پر چڑھ کے دور میدان میں لگے ہوئے بیساکھی کے میلے کو دیکھنے لگی۔ دور کھڑی ہوئی پارو کو صرف لوگوں کا ہجوم ہی ہجوم دکھائی دیتا تھا۔

لمبے تڑنگے توانا کسان کوری کوری تہمدیں باندھے ہوئے اور ہاتھوں میں تیل سے چمکائی ہوئی لاٹھیاں لئے ہوئے بڑے جوش وخروش میں ادھر آتے اور ادھر جاتے تھے۔ کئی گھوڑوں پر سوار اور اپنے پیچھے عورتوں کو بھی بٹھائے ہوئے تھے اور اپنے آگے ایک دو بچے بھی۔ کئی ایک بچوں کو انگلی پکڑائے ہوئے اور عورتوں کو پیچھے پیچھے لئے ہوئے چلے جاتے تھے۔ کئی جوان اپنی جوانی کے جوش میں چھاتی کو ابھارے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ کچھ گاتے جاتے تھے۔ کچھ باتیں کرتے جاتے تھے۔ دور میدان میں دنگل ہو رہا ہوگا جلیبیوں کے تھال رکھے ہوئے ہوں گے۔ گرم گرم پکوڑوں کی خوشبو دور تک پھیلی ہوئی ہوگی۔ گڑ اور شکر پارے، میدے کی مٹھائیاں اور مٹھائیاں ڈھیر کے ڈھیر لوہے کے بڑے بڑے تھالوں میں سجی ہوئی ہوں گی۔

پارو کے دل پر ہتھوڑے کی چوٹ سی پڑی اور اسے خیال آیا کہ اس کی ماں کے یہاں تین لڑکیوں کے بعد لڑکا پیدا ہوا تھا۔ اس دفعہ...... اس دفعہ اس کی پہلی بیساکھی تھی۔ کھڑی کھڑی پارو بیٹھ گئی۔ شاید اس وقت اس کی ماں نے اس کے ننھے بھائی کو پانی چکھایا ہوگا۔ قریب کی کسی ندی میں سے پانی لے کر گلاب کے پھول کو اس پانی میں ڈبو کر اس کے بھائی کے ننھے ہونٹوں سے لگایا ہوگا۔ پھر اس کی ماں کو مبارکبادیں ملی ہوں گی۔ شاید...... شاید اس وقت اس کی ماں کو اپنی جائی پارو بھی یاد آئی ہو۔ پارو کی آنکھوں میں آنسو بھی نہیں آتے تھے۔ وہ سر کو پکڑے ہوئے بیٹھی رہی۔

جوان کسانوں کی ایک ٹولی کانوں میں پھول لٹکائے ہوئے مستی گاتی ہوئی دور سے گزر رہی تھی۔ ان میں سے کوئی جوان کسان گا رہا تھا۔

ہوتے نیں جی داتن کردی چٹیاں دنداں دی ماری

(کنوئیں پر بیٹھی داتن کر رہی ہے تاکہ دانت سفید ہو جائیں)

نی آپے تینوں لے جان گے (اری تجھے خود لے جائیں گے)

جناں نوں لگیں گی پیاری (جن کو تو پیاری ہوگی)

نی آپے تینوں لے جان گے (اری تجھے خود لے جائیں گے)

''ہائے، کوئی پیاری لگنے والیوں کی حالت تو دیکھے'' پارو کے منہ سے آہستہ سے یہ لفظ نکلے۔

پھر پارو کو خیال آیا، وہ رشید کو بھی پیاری لگی تھی، رشید اس کو لے آیا، وہ اپنے منگیتر رام چند کو پیاری کیوں نہ لگی۔ اس نے تو بات بھی نہ پوچھی۔ وہ تو رام چند کو پیاری لگنا چاہتی تھی۔ رشید کو تو نہ اس نے ڈھونڈا تھا۔ نہ اس کے ماں باپ لائے تھے۔

کسان اچھلتے کودتے جا رہے تھے۔ وہ بھنگڑہ (ناچ) ناچ رہے تھے۔ وہ بولیاں گا رہے تھے۔

تیرے لونگ دا پیا لشکارا (تیرے لونگ کی چمک پڑی)

ہالیاں نوں ہل بھل گئے (ہل والے اپنے ہل بھول گئے)

پارو سوچتی رہی۔ سب ہی گیت حسین لڑکیوں کی تعریف کرتے ہیں۔ سارے بھجن پی کی محبت کا ذکر کرتے ہیں۔ کبھی وہ گیت بھی بنیں گے جن میں مجھ جیسی لڑکیوں کے رونے لکھے ہوں گے۔ کبھی وہ بھجن بھی ہوں گے جن کا بھگوان کوئی نہ ہو۔

چڑھتی جوانی کی کچھ مٹیاریں (دوشیزائیں) اپنی جوانی کے جوش میں ٹولیاں بنا کر کھیتوں کی طرف جا رہی تھیں۔ دور جاتے ہوئے جوان کسان انہیں مڑ مڑ کر دیکھتے جاتے تھے اور ہنستے جاتے تھے۔ شاید ان سے مذاق کر رہے تھے۔ انہیں دیکھ دیکھ کر پارو سوچنے لگی اگر ابھی سب جوان لڑکیوں کو یہ سب جوان اپنی گھوڑیوں پر ڈال کر بھاگ جائیں...... پھر کیا ہو اگر یہ سب لڑکیوں کو اٹھا کر لے جائیں...... !!

گرمی کا موسم پوری طرح آ گیا تھا۔ زمین 'من چھتی' (اینڈھسن) ڈال کر جلائے ہوئے تندور کی طرح جل رہی تھی۔ پارو کبھی بیٹھتی اور کبھی اٹھتی۔ اور کبھی لیٹ جاتی۔ آج اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد پانی پیتی۔ اس کی پڑوسن نے اسے بتایا تھا کہ جیسے تیسے سر دھو لے اور نہا لے، کیا پتہ کہ اس رات کو یا دوسرے دن پارو کے یہاں کچھ ہو جائے، پھر پارو کئی دن اٹھ نہیں سکے گی۔

رشید نے دیکھا کہ پارو کا رنگ جسم میں اٹھتے ہوئے دردوں کی وجہ سے سفید ہوتا جاتا ہے۔ رشید کو وہ وقت یاد آ گیا جب وہ چھتووانی کی کچی سڑک پر پارو کو گھوڑی پر ڈال کر بھاگا تھا۔ پارو کا رنگ اس وقت بھی پھٹکری کی طرح سفید ہو گیا تھا۔ اس وقت پارو کی روح میں ٹیسیں ابھر رہی تھیں۔ آج اس کے جسم میں......

رشید نے رحیم کے گھر اپنے کھیت کا ایک کسان بھیج دیا۔ پارو کو اکیلا چھوڑ کر جانے کی اسکی ہمت نہیں ہوئی۔ رحیم کی ماں جب وہاں پہنچی تو پارو کے منہ پر تیز درد بل کھا رہے تھے۔ آتے ہوئے رحیم کی ماں اپنی گلی والی ریشماں دائی کو بھی ساتھ لیتی آئی تھی جس نے رحیم کی دونوں بیویوں کو دو دو تین تین لڑکے اور لڑکیاں جنوائی تھیں۔

دائی نے آتے ہی پرانی دری کو فرش پر بچھا کر پارو کو لٹا دیا۔ پارو چارپائی کی نرمی چھوڑ کر سخت زمین پر تڑپنے لگی۔ رشید کمرے کے باہر کھڑا رہا۔ اندر بند دروازے میں سے پارو کے بھینچے ہوئے منہ سے نکلی ہوئی مدھم سی کراہیں سنائی دیتی تھیں۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ پارو کے جسم کے سب نہیں تو آدھے تہائی درد ہی کھینچ کر اپنے جسم میں سمو لے۔ پارو اکیلی تڑپ رہی تھی۔

منٹ کے بعد منٹ گزر گئے، لیکن پارو کی آواز نہ آئی۔ رشید کے دل

میں خوف سا پیدا ہوا کہ پارو زندہ تو ہے نا؟ تھوڑی بہت آواز بھی کیوں نہیں آتی۔

آدھا پونا گھنٹہ گزر گیا تھا۔ جب دائی نے باہر آ کر رشید سے کہا۔ بیٹا! مبارک ہو، لڑکا ہوا ہے۔"

"اس کا کیا حال ہے؟" رشید نے پوچھا۔

"خیریت سے ہے بیٹا! یونہی نسل بڑھتی ہے۔ کوئی بیٹے چھت سے تو نہیں گرتے۔"

جب رشید اندر گیا تو لیٹی ہوئی پارو کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کے پہلو میں سفید آنچل میں لپٹا ہوا اس کا اور رشید کا بیٹا انگوٹھا چوس رہا تھا۔ رشید کو فخر محسوس ہوا۔ اس نے پارو کو جیت لیا تھا۔ جوئے کے اس کھیل میں اس نے سب کی سب پارو کو جیت لیا تھا۔ اب پارو صرف اغوا کی ہوئی رکھیل نہیں تھی۔ اب پارو صرف اس کے گھر پڑی ہوئی عورت نہیں تھی۔ اب پارو اس کے بیٹے کی ماں تھی۔

رحیم کی ماں نے کہا تو رشید نے ایک روپیہ اور گڑ بچے کے سر پر سے اتارا۔ اب پارو کی اونگھتی ہوئی آنکھیں کھلیں۔ اس نے رشید کو دیکھا۔ اب تو مجھے کیا کہتا ہے؟ میں نے تجھے اپنا آپ دے دیا۔ ایک بیٹا دیا۔ اب میرے پاس کیا باقی رہ گیا؟ گم سم پارو رشید سے کہہ رہی تھیں۔ پارو نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

گرم گڑ اور پسے ہوئے بادام کے کچھ چمچے پینے کے بعد جب پارو کے بدن میں کچھ طاقت آئی تو اس نے دیکھا کہ اس کے بائیں بازو سے اس کے بچے کا نرم نرم منہ لگ رہا ہے۔ پارو تھرتھرا اٹھی۔ اسے محسوس ہوا کہ نرم سفید کیڑا اس کے جسم پر چڑھ رہا ہے۔ پارو کے دل میں کراہیت پیدا ہوئی۔ اس کا جی چاہا کہ بازو سے لگے ہوئے کیڑے کو جھٹک دے۔ اپنے جسم سے دور کر دے۔ اس طرح جیسے کوئی ناخن سے پلڑے کے چھبے ہوئے کانٹے کو نکال دیتا ہے۔ جس طرح

کوئی چمٹے ہوئے گوبر کو اتار دیا۔ جس طرح کوئی بدن پر لگی غلاظت الگ کرتا ہے۔ جس طرح کوئی چمٹی ہوئی جونک کو کھینچ لیتا ہے۔

رحیم کی ماں کو ان کے گھر میں پورے تیرہ دن رہنا تھا۔ ابھی تو پارو کے لڑکا پیدا ہوئے چار ہی دن ہوئے تھے۔ پانچویں دن پارو کی چھاتیوں میں دودھ آیا۔ اب تک دائی روئی کی بتی سے اس کے بچے کو دودھ دیتی رہی تھی۔ آج اس نے دودھ دینے کے لئے بچے کو پارو کی گود میں دیا۔ بچہ پارو کی گود میں پڑا رہا۔ وہ اس سے لپٹا رہا۔ اس کے بدن میں ایک کھینچاؤ سا پیدا ہوا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بچے کو گلے لگا کر روئے۔ بچہ اس کے اپنے لہو سے بنا ہوا کھلونا تھا۔ بچہ اس کے گوشت کا بت تھا۔ بھری ہوئی دنیا میں یہی ایک بچہ اس کا اپنا تھا۔

بچہ پارو کا دودھ پیتا رہا۔ پھر پارو کو محسوس ہوا کہ یہ بچہ زبردستی اس کی نسوں میں سے اس کے دودھ کو کھینچ رہا ہے...... زبردستی...... زبردستی...... بچے کے باپ نے بھی تو اس سے زبردستی کی تھی۔ بچہ بھی تو اپنے باپ کا بیٹا تھا۔ اپنے باپ کا خون تھا۔ اپنے باپ کا گوشت تھا۔ اپنے باپ کا روپ تھا۔ زبردستی یہ بچہ اس کے جسم میں رکھا گیا تھا۔ زبردستی اس بچے نے اس کے پیٹ میں پرورش پائی تھی۔ اب زبردستی یہ بچہ اس کی نسوں میں سے دودھ کھینچ رہا ہے۔

پارو نے اپنے ماتھے کو چھوا۔ آگ میں پڑی ہوئی اینٹ کی طرح اس کا ماتھا گرم تھا۔ شاید اس کو بخار چڑھا ہوا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک ہی خیال چکر لگانے لگا...... یہ بچہ...... اس بچے کا باپ...... سب مرد...... مرد...... مرد جو عورت کے جسم کو اس طرح برتتے ہیں جس طرح کتا ہڈی کو چوستا ہے اور چباتا ہے۔

بچہ پارو کا دودھ پیتا رہا۔ پارو کا دل رہٹ کی ہانڈی کی طرح بھرتا رہا اور خالی ہوتا رہا۔

پارو کے گول مٹول بچے کو سب جاوید کہتے تھے۔ سُتلی کی پلنگڑی پر لٹا کر پارو اس کو دیکھتی رہتی...... دیکھتی رہتی۔ وہ ہاتھ پاؤں مار کے اوپر کی چادر کو اتار ڈالتا اور پیروں میں روند دیتا۔ پارو نے اس کے پاؤں میں چاندی کی پتلی سی پازیب پہنائی ہوئی تھی۔ جب وہ پاؤں مارتا تو پازیب کی جھنکار پلنگڑی پر گونج اٹھتی تھی۔ پاؤں مارتے مارتے اس کا منہ سرخ ہو جاتا اور اس کو ہچکیاں آنے لگتیں۔

صبح صبح پارو کھیتوں میں جاتی۔ رشید اپنے بیٹے کے پاس بیٹھتا۔ ایک دن ابھی اندھیرا ہی تھا کہ پارو کھیتوں سے لوٹ رہی تھی۔ مسلمانوں کے باہر والے کنوئیں سے اس نے ہاتھ پاؤں دھوئے اور جب وہ اپنے گھر کی طرف لوٹ رہی تھی۔ اس کی اپنی گلی کی ایک لڑکی کمو دکھائی دی۔

ہلکی ہلکی سردی تھی۔ کمو پانی کی گاگر کو ڈھیلوں کے ڈھیر پر رکھ کر سستا رہی تھی۔ پارو جب اس کے پاس سے گزری۔ کمو نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اٹھالی۔ گاگر کا بوجھ کمو کے کندھوں سے سہا نہیں جاتا تھا۔ گاگر کمو کے کندھے سے پھسلنے لگی۔ گاگر کے نیچے لگی ہوئی کمو کے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کلائی سے دہری ہونے لگی۔ بائیں ہاتھ سے گاگر کو سہارا دیتے ہوئے کمو کے منہ سے نکلا "اری ماں!" پارو کے قدم رک گئے۔ وہ کمو کے پاس گئی۔ اس کے جی میں آیا۔ وہ بارہ برس کی بچی اور کمزور سی کمو کے کندھے سے گاگر اٹھا لے۔ کمو اس کے ساتھ ساتھ چل پڑے۔ کمو جو ننگے پاؤں تھی کمو جو ہمیشہ بے حد کی شلوار کے پائنچے چڑھائے رکھتی تھی۔ کمو جس کی دھاری دار قمیض کے کندھے پر لگا ہوا پیوند تھا

ادھر جاتا تھا اور کبھی لگ جاتا تھا۔ کمو جس کی میلی اوڑھنی ہمیشہ پھٹی رہتی تھی۔ کمو جس کے بال ہمیشہ بان کی طرح کھردرے اور بکھرے رہتے تھے۔ کمو جس کو پارو نے ہمیشہ دور ہی سے دیکھا تھا، آج اس کے قریب ہو کے اس کے کندھے سے گاگر اٹھا لے، جس کے کندھے کی ہڈیاں پیتل کی گاگر سے ٹکرا رہی تھیں۔

"بڑی دیر ہوگئی ہے۔" گاگر کے بوجھ سے دبی ہوئی کمو نے پارو سے ابھی دیر نہ ہونے کی تسکین چاہی۔

"ابھی تو دن بھی نہیں نکلا۔" پارو نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ شاید کمو کو حوصلہ ہوگیا۔ پھر اس نے گاگر کندھے سے زمین پر رکھ دی۔ گاگر کے منہ سے پانی چھلک کر کمو کے کندھے پر گر گیا۔ دھاری والی گھسی ہوئی قمیض کو بھگو کر پانی نے کمو کے جسم کو ٹھنڈا کر دیا اور سردی کی کپکپاہٹ کمو کے جسم میں پھیل گئی۔

پارو ٹھہر گئی۔ کمو اپنے پیلے منہ سے پارو کی طرف دیکھ کے ہنس پڑی۔ کچھ پہلے کمو دیر ہونے کے ڈر سے اور گاگر کے بوجھ سے سہمی ہوئی تھی۔ کمو کے منہ پر پارو نے ہمیشہ ایسا ہی ڈر دیکھا تھا۔ اس وقت اس کے چوڑے ہونٹوں پر بکھری ہوئی ہنسی اسے ایسی معلوم ہوئی جیسے اس لڑکی کو ہنسنا ہی نہیں آتا اور وہ یوں ہی اپنے ہونٹوں کو موڑ رہی ہو، جیسے کسی کا منہ چڑایا جائے۔

"کمو تو روز اسی وقت آتی ہے؟" پارو نے کمو کو پکارنے والی آواز سے کمو کا نام سنا ہوا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ آج کچھ دیر ہوگئی ہے، مجھے مار پڑے گی۔" کمو نے پھر گاگر اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ جیسے "وقت" کا نام اس کے لئے بہت ڈراؤنا تھا۔ اس کی ہنسی کچے رنگ کی طرح اس کے چہرے سے اتر گئی اور اس کے چہرے پر پھر پہلے جیسا ہی خوف اُبھر آیا۔

"کمو، وہ تیری کیا لگتی ہے؟"

"چاچی" کمو نے کہا۔ کمو کا ہاتھ گاگر کے بوجھ سے لچک گیا۔ پتہ نہیں گاگر کے بوجھ سے، پتہ نہیں، چاچی کے لفظ سے۔

"اگر تو کہے تو میں تیری گاگر اٹھاؤں۔" پارو نے کہا۔ لیکن اس نے ہاتھ آگے نہ بڑھایا۔ پارو کو اچھی طرح یاد تھا کہ سب لوگ جانتے ہیں کہ اس کا نام حمیدہ ہے۔ حمیدہ رشید کی بیوی...... اور کمو ایک ہندو لڑکی ہے۔

"گاگر چھو جائے گی۔" کمو نے بے دھڑک ہو کے کہا۔

"پانی تو نہیں چھو جائے گا۔ میں پانی کو ہاتھ نہیں لگاؤں گی۔ گھر جا کر گاگر کو باہر باہر سے مانجھ لینا۔" پارو کہتے کہتے ہنس پڑی۔ کمو بھی جیسے ہنس پڑی۔ لیکن کمو نے گاگر نہیں دی۔ دونوں صرف چند قدم ہی آگے گئی تھیں کہ کمو کا پاؤں دہرا ہوگیا۔ پارو نے گرتی ہوئی گاگر پکڑ لی اور کمو کنکر پتھروں پر گر پڑی۔ کمو کے پاؤں میں موچ آ گئی تھی۔ پارو نے گاگر رکھ کر کمو کا پاؤں پکڑا اور ہتھیلی سے کمو کے پاؤں کو ملا۔ پھر کمو اٹھنے کے قابل ہوگئی۔ پارو گاگر اٹھا کے اس کے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔

"اری ماں!" کمو رو پڑی۔

پارو کو ایسا محسوس ہوا جیسے کمو اپنے سب دکھوں کی شکایت اپنی مرحوم ماں سے کر رہی ہو۔

گاؤں صاف دکھائی دینے لگا تھا۔ اُجالا بڑھ گیا تھا۔ ان کی گلی کا موڑ بھی نزدیک آ گیا تھا۔ دونوں کو ڈر تھا۔ کہ پارو کو گاگر اٹھاتے کوئی دیکھ نہ لے۔ کمو نے ڈگمگاتے ہوئے گاگر سنبھال لی۔ پارو نے جلدی جلدی قدم بڑھائے اور وہ کمو سے الگ ہو کر گلی کی طرف بڑھ گئی۔

اس دوپہر کو بچہ ضد کر رہا تھا۔ پارو اپنے بچے کو بہلا رہی تھی۔ جب کمو

دروازہ کھول کر اندر آئی۔ پارو نے آگے بڑھ کر کمو کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔
پارو کو محسوس ہوا کہ کمو اس کے بچے سے زیادہ بہلائے جانے کی مستحق ہے۔ کمو
جس کے سوکھے آنسوؤں کو کوئی نہ دیکھتا تھا، پارو کے بازوؤں میں اس کے آنسو
نکل پڑے۔ پارو کے جی چاہا کہ جیسے وہ جاوید کی ماں ہے اسی طرح کمو کی ماں
بھی بن جائے۔ کمو ضد کرے کسی بات پر اڑ جائے اور وہ کمو کو اٹھا اٹھا کر بہلائے
کمو کو لئے لئے پھرے کمو کو چوم چوم نہ تھکے۔ وہ جاوید کی ماں ہے۔ وہ کمو کی ماں
بھی بن جائے۔ وہ سب بے ماؤں کی ماں بن جائے۔ وہ اچھی بیٹی نہیں بن سکتی
تھی تو اچھی ماں بن جائے۔

کمو ہندو تھی اور پارو...... پارو ایک مسلمان تھی۔ چاہے وہ اپنے آپ کو
پارو ہی سمجھتی تھی۔ کمو پارو کے گھر کا کچھ بھی نہیں کھا سکتی تھی۔ پارو کا جی چاہتا تھا
کہ وہ کمو کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلائے۔ دودھ کا کٹورا پلائے...... پارو نے پھر
کمو کا پاؤں ملا۔ ہتھیلیوں سے گرم گھی ملا۔ پرانی روئی سے سینک دیا۔

اب کمو جانے کے لئے بیتاب ہو گئی۔ اس کی چاچی کا جھاڑو اس کی
آنکھوں میں سلائیوں کی طرح پھر رہا تھا۔ کمو لحاف سینے والی سوئی لینے کے
بہانے سے آئی تھی۔ پارو نے کمو کو بادام والا گڑ کھلایا اور پھر لحاف سینے والی سوئی
اندر سے نکال کر دی۔

سردی دن بدن بڑھتی جاتی تھی۔ لوگ موٹے کپڑے پہننے لگے تھے۔
لوگوں نے روئی بھروا بھروا کے کالی چھینٹ کی واسکٹیں بنوائی تھیں۔ موٹے کھیس
کی لپیٹ میں اپنے کندھوں کو چھپا لیا تھا۔

کمو بڑی ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن کمو کے جسم پر نہ جوانی چڑھتی تھی نہ
کمو کے کپڑے بدلتے تھے۔ کمو کے ننگے پاؤں سردی سے ٹھٹھرنے لگے تھے۔

پارو نے کمو کے لئے ایک نئی جوتی بنوائی۔ لیکن کمو کے پاؤں میں اس جوتی کا
پہنایا جانا آسان نہ تھا۔ اس نے بہت سوچا آخر کمو نے وہ جوتی پہن لی اور چاچی
سے کہا۔ گنّے کے سامنے والے کھیت سے ملی ہے۔ چاچی مانتی تو نہ تھی کہ کون ہے
گاؤں میں ایسی جوئی جوتی یوں گم کر آئے۔ لیکن وہ چپ رہی اور کمو جوتی پہنے
رہی۔ لیکن نئی چیزیں روز روز تو کسی کو ملتی نہیں۔

کمو ایک دو بار پارو کے گھر بھی چلی جاتی تھی۔ کبھی بیٹھنے میں کپاس بیلنے
لگتی تھی۔ کبھی چکی میں چنے دلنے لگتی تھی۔ کبھی ہاون دستے میں مسالہ پیس دیتی
تھی۔ پارو اس کا ہاتھ بٹاتی۔

ایک دن صبح منہ اندھیرے کمو پارو کو پکڑ پکڑ کر روئے جا رہی تھی۔ پارو
نے غور سے دیکھا۔ کمو گنّے کے چھلکے کی طرح چسی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ پارو
نے اسے کلیجے سے لگایا۔ ماتھا چوما لیکن کمو کا رونا رکتا ہی نہ تھا۔

میری چاچی کہتی ہے کہ ''اگر تو اس کے گھر گئی تو میں خون پی جاؤں گی۔''
آخر کمو نے بتایا اور وہ پارو کی چھاتی سے سر لگائے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

''لیکن میں نے کیا کیا ہے؟'' پارو نے کچھ توقف کے بعد پوچھا۔

چاچی کہتی ہے کہ ''وہ تو بھاگ کر آئی ہوئی ہے، تو بھی اسی طرح بھاگ
جائے گی۔'' کمو نے رونا روک کر کہا۔ سویرے کا اجالا نکھرا جا رہا تھا۔ پارو روئی
کی ٹوٹی ہوئی پندیا کی طرح ہو گئی۔

رشید کا دل روز جل جل کر اب بجھنے لگا تھا۔ پارو کا دن بدن سوکھتا ہوا چہرہ رشید سے دیکھا نہیں جاتا۔ رشید کے صحن میں جیسے ویرانی نے ڈیرا جما لیا تھا۔ رشید کے منہ کو بھی چپ سی لگ گئی۔ دونوں گھر کی، سماج کی اور جسم کی دیواروں میں گھرے ہوئے تھے لیکن دونوں کے درمیان جیسے فاصلے حائل ہو گیا تھا۔

پارو کے گھر دودھ دینے والی بھینس تھی۔ وہ بلا ناغہ دودھ جماتی، دہی بلوتی۔ رشید کے کھیتوں کے مزدور جب چارہ لے کر آتے پارو ان کو اور ان کے بچوں کو چھاچھ کے کٹورے بھر کر اور مکھن ڈال کر دے دیتی تھی۔ اس کے منہ میں کچھ نہ جاتا تھا۔ رشید کا دل بھی جیسے کھانے پینے سے اٹھ گیا تھا۔ گھر کے چولھے میں آگ جلتی تھی۔ لیکن گھر کی بول چال پر اور زندگی کی ہریالی پر کہرا جم گیا تھا۔ جاوید کے معصوم چہرے پر جیسے ماں باپ کے اداس چہروں کے سائے پڑ گئے تھے۔ جاوید کے لئے کوئی خاص چاؤ نہیں رہ گیا تھا۔ چاہے پارو سب کام کرتی تھی۔ چاہے رشید جاوید کو دل سے بہت پیار کرتا تھا۔

ایک رات سوتے سوتے رشید کا جسم گرم ہو گیا۔ صبح جب پارو نے رشید کے ماتھے کو چھوا، تو رشید کو بہت تیز بخار چڑھا ہوا تھا۔

گاؤں کے حکیم نے دوا دی۔ رشید کے بخار کو تیسرا دن ہو گیا تھا کہ حکیم نے شبہ ڈال دیا کہ رشید کو میعادی بخار ہے۔

پارو کی ساری بے دلی اور اداسی کو رشید کی بیماری نے دور کر دیا تھا۔ وہ دوا دیتی رشید کے جسم کو دباتی۔ گھر کا کام کاج کرتی، جاوید کا منہ اتر گیا تھا۔ دوپہر ہو جاتی تھی۔ جاوید کے منہ پر رالیں جم جاتی تھیں۔ پارو کو اس کی خبر لینے کی

فرصت نہ ہوتی۔ کئی راتیں گزر گئیں۔ کئی دن بیت گئے۔ لیکن رشید کا بخار نہ اترا۔

''پارو میرا گناہ بخش دے۔ پارو میرا قصور معاف کر دے۔ پارو......
پارو......'' رشید بخار کی بے ہوشی میں بڑبڑا رہا تھا۔ رات کا تیسرا پہر تھا۔ پارو گھبرا گئی۔ دنوں کی تکلیف اور راتوں کی بیداری نے پارو کو پہلے ہی توڑ ڈالا تھا۔ گھبرائی ہوئی پارو اٹھ کر رشید کی چارپائی کے پاس بیٹھ گئی۔ رشید کے ماتھے پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ رشید کے پاؤں دباتی رہی۔ لیکن رشید کو ہوش نہ تھا۔

''اچھا، پارو میں چلتا ہوں...... پارو میری روت......'' رشید کی بہکی ہوئی باتیں کرتا رہا۔ پارو کا دل بالکل ڈوبنے لگا۔

''بس کر، رشید! میرے زخم پر نمک مت چھڑک'' پارو نے بلک کر کہا۔ لیکن رشید کو ہوش نہ تھا۔ رشید اسی طرح کی باتیں کہہ رہا تھا۔ کوئی بات پارو کی سمجھ میں آتی اور کوئی بات رشید کے گلے میں سے نکل کر ہونٹوں پر ہی ختم ہو جاتی۔ رات کا اندھیرا بہت گہرا تھا۔ پارو گھر میں اکیلی تھی۔ لیکن پارو کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ ساری دنیا میں اکیلی ہے۔ رشید کے بغیر پارو کے زخموں پر کوئی پھاہا نہیں رکھے گا۔

گھڑے کے ٹھنڈے پانی میں کپڑا بھگو کر رشید کے ماتھے پر رکھا۔ ماتھا چولھے کی اینٹ کی طرح تپ رہا تھا۔ کپڑے پانی میں بھیگے رہے۔ کٹورے کا پانی تھوڑی ہی دیر میں گرم ہو گیا۔ پارو نے پانی بدلا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گر گر کر رشید کے ماتھے پر پڑتے رہے۔ جب صبح کی پو پھٹی، اس وقت پتہ نہیں، پانی کی ٹھنڈک سے یا آنسوؤں کی نمی سے رشید کا بخار کم ہو گیا۔ رشید کا جسم کچھ ٹھنڈا ہوا۔ اس کی بے ہوشی نیند نے آرام میں بدل دی۔

رشید کی آنکھ کھلی تو اس کا [illegible] ہلکا پھلکا محسوس ہوا۔ آج اس کے سر میں درد [illegible] آنکھیں [illegible]۔ رشید نے آرام کا سانس لے کر بائیں پہلو کی

کروٹ بدلی۔ پارو رشید کے سرہانے ہی زمین پر بیٹھی بیٹھی چارپائی کا سہارا لے کر سوگئی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں ابھی تک گیلا کپڑا تھا اور پاؤں کے پاس پانی کا کٹورا پڑا ہوا تھا۔ رشید نے بھرے ہوئے جی سے پارو کا منہ دیکھا۔ اس کا اترا ہوا منہ، نیند میں کھویا ہوا تھا۔ اپنی ساری بیماری، پارو کی ساری خدمت رشید کے دل کو یاد آ رہی تھی۔ گزری ہوئی رات کی مصیبت کا رشید نے پارو کے چہرے سے، کٹورے اور کپڑے کی پٹیوں سے اندازہ لگالیا۔ رشید نے اپنا کمزور سا دایاں ہاتھ پارو کے سر پر رکھ دیا۔ پارو کے بکھرے ہوئے بالوں میں رشید کی انگلیاں پھرتی رہیں۔ رشید کی انگلیوں کے پورے پارو کے کانوں کو اور ماتھے کو آہستہ آہستہ چھوتی رہیں۔ پارو کا سارا جسم نیند کی جھولی میں پڑا ہوا تھا۔ آنکھوں کے کونوں سے آنسو بہہ بہہ کر رشید کے تکیے پر گرتے رہے۔ رشید ایک عجیب ہی کیفیت میں جاگتا رہا۔

رشید نے پارو کے جسم کو جیت لیا تھا۔ رشید کو یہ حسرت بھی تھی کہ وہ پارو کے دل کو بھی جیت لے۔ پارو کی اداسی رشید کو نوچ نوچ کر کھاتی تھی۔ اس وقت پارو ٹوٹی ہوئی، کنڈل کی طرح رشید کی چارپائی سے لگی ہوئی تھی۔ رشید میں ہمت نہیں تھی، لیکن رشید کے دل میں آرزو تڑپ رہی تھی کہ وہ پارو کو کلیجے سے لگالے۔ پچھلے دنوں کی بھرپور اداسی سے رشید کا دل چوٹ کھایا ہوا تھا۔ اس وقت رشید کو پارو کے چہرے پر ایسا دکھائی دے رہا تھا جیسے اس کے دل میں رشید کے علاوہ کچھ نہیں۔ رشید نے ہاتھ اور آگے بڑھا کر پارو کی گردن میں ڈال دیا شاید گردن کے گرد ہاتھ زور سے پڑ گیا۔ اس سے پارو جاگ اٹھی۔ پارو ڈر گئی۔ لیکن رشید خیریت سے تھا۔ رشید کا بخار بہت اترا ہوا تھا۔ رشید بہت پیار بھری نظروں سے پارو کو دیکھ رہا تھا۔

پورے دس دن ہو گئے تھے رشید کو چارپائی پر پڑے ہوئے۔ رشید کا بخار رفتہ رفتہ اترتا گیا۔ رشید بہت کمزور ہو گیا تھا۔ لیکن اس کا دل بہت پرامنگ تھا۔

پارو نے اپنا سارا دھیان رشید پر مرکوز کر لیا تھا۔ اس کے پاس بیٹھ بیٹھ کر پارو نے دن رات ایک کر دیئے تھے۔ جاوید کو نہلا دھلا کر پارو رشید کے پاس بٹھا دیتی تھی۔ جاوید کو پارو چھوٹے چھوٹے بول سکھا دیتی تھی۔ جاوید رشید کے ارد گرد لڑھکتا ہوا اس کی نقلیں اتارتا تھا۔ ماں کے سکھائے ہوئے بولوں کو تتلا تتلا کر بولتا تھا۔ رشید کا دل بہت خوش تھا۔ اس کا جسم پھول کی طرح ہلکا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اپنی بیماری کو دعائیں دیتا تھا، خوشی پہلے سے دوگنی اور تگنی ہو کر اس کے آنگن میں لوٹ آئی تھی۔

پارو کا دل چاہنے لگا کہ کسی دن وہ سچ مچ ہی بھول جائے کہ رشید نے اس کے ساتھ ظلم کیا تھا۔ وہ رشید کو بہت پیار کرے۔ رشید اس کا خاوند تھا۔ رشید اس کے بچے کا باپ تھا۔ بس ایک یہی سچ تھا اور سب جھوٹ تھا۔

اگلے چند دنوں کے دوران رشید اپنے گاؤں چھتووالی کے ایک دو پھیرے کر چکا تھا۔ اس کے بھائی کے ساتھ جو زمین تھی اس نے اس کا اناج وغیرہ وصول کر کے فروخت کر دیا تھا لیکن پارو جس دن سے سکڑیالے آئی تھی اس نے گاؤں سے باہر قدم نہیں نکالا تھا۔ کبھی رشید کچھ کہتا تو پارو ہنس کر کہہ دیتی کہ وہ اپنی مرضی سے اس گاؤں آئی تھی نہ وہ اپنی مرضی سے اس گاؤں سے جائے گی۔

جاوید اب دوڑتا پھرتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی کرتا تھا، پارو چولھے کو چکنی مٹی سے پوتی تھی۔ جاوید دوڑتا ہوا آتا اور گیلی مٹی میں ہاتھ تھپتھپا دیتا۔ پارو کے بنے ہوئے چولھے کو بگاڑ جاتا۔

ایک دن ایک عورت گلی میں مٹی کے کھلونے بیچ رہی تھی۔ جاوید نے مٹی کے کھلونے اور سرکنڈے کے جھنجھنوں کو دیکھا اور پارو کا آنچل کھینچنے لگا۔ پارو نے دانوں کی مٹھی دے کر مٹی کے کھلونے لئے۔ وہ ابھی گلی ہی میں بیٹھی ہوئی تھی کہ دور

سے بھاگتے بھاگتے ایک پگلی گزری۔ عورتوں نے دوڑ کر اپنے بچوں کو چھپا لیا۔ دروازے بند کر لیے، بچے رونے لگے۔ پگلی نے پنڈلیوں تک اونچی شلوار پہنی ہوئی تھی اور اس کے جسم کے اوپر والے حصے پر کوئی کپڑا نہیں تھا۔ رنگ اس کا دھوپ سے جھلسا ہوا تھا یا پتہ نہیں یونہی کالا تھا۔ اس کے سر پر بال لٹیں بن گئے تھے۔ جیسے وہ جب سے پیدا ہوئی ہے کبھی نہائی ہی نہ تھی۔ ٹانگوں کو عجیب طور سے مروڑتی تھی۔ بانہوں کو عجیب انداز سے پھیلاتی تھی۔ اس کے منہ کو دیکھنے سے اس کی ڈراؤنی ہنسی کے درمیان اس کے چھدرے دانتوں ہی پر نظر پڑتی تھی۔ اس سوکھے سڑے جسم سے عمر کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ لگتا تھا بس ایک ڈھانچہ چل پھر رہا ہے۔

پارو دیکھتے دیکھتے کھڑی رہی۔ پگلی دوڑتی دوڑتی آئی اور کھلونے بیچنے والی کے چھاج میں سے مٹی کے کھلونوں کی دو مٹھیاں بھر کر دوڑ گئی۔ اس کی ڈراؤنی اور چیختی ہوئی ہنسی دیر تک اس گلی میں گونجتی رہی۔

پگلی چلی گئی۔ عورتیں دروازے کھول کر باہر آ گئیں۔ کھلونے بیچنے والی اپنے آدھے چھاج کو دیکھتی رہی اور عورتیں ہنستی رہیں کہ وہ پگلی مٹی کے کھلونوں اور جھنجھنوں سے کس کو کھلائے گی۔ پگلی سارا سارا دن پھرتی رہتی۔ کھیتوں میں گھومتی پھرتی اور کیاریوں میں سے کچھ توڑتی اور کھا لیتی۔ کئی بار عورتیں روٹیاں پگلی کے سامنے ڈال دیتی تھیں، وہ چبا لیتی۔ کئی بار عورتیں اس کو پرانا کرتا پہنا دیتی تھیں۔ پگلی کھلکھلا کر ہنس پڑتی تھی۔ کچھ دیر وہ کرتا پہنے رہتی پھر اس کے بٹن توڑ ڈالتی تھی۔ پھر کسی دن کرتے کو دانتوں سے پھاڑ ڈالتی تھی۔ دھجیاں اس کے جسم پر جھولتی رہتیں۔ پھر پگلی ان دھجیوں کو بھی اپنے جسم سے الگ کر ڈالتی تھی۔ کبھی اپنے جسم پر سے سب کچھ اتار دیتی تھی۔ پھر عورتیں کوئی پھٹی پرانی شلوار کوئی پھٹا پرانا کرتا اس کو پہنا دیتیں۔

پگلی اب سکریالے گاؤں میں رس بس گئی تھی۔ اس کو روز دیکھنے کی سب

کو عادت پڑ گئی تھی۔ کئی بار گاؤں کے چھوٹے چھوٹے بچے اس کے گرد ہو جاتے تھے۔ تالیاں بجاتے تھے۔ اس کو دوڑاتے اور اس کے پیچھے دوڑتے تھے پھر کوئی آتا جاتا بڑا آدمی بچوں کو دھمکاتا تھا بچے اس کا پیچھا چھوڑ دیتے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں نے ضد کرنی چھوڑ دی۔ مائیں انہیں پگلی کا خوف دلاتی تھیں۔ ''پگلی پکڑ کر لے جائے گی۔'' روتے بچے سہم کر چپ ہو جاتے تھے۔

پگلی کسی چھپر کے نیچے پڑ جاتی۔ کئی بار کوئی اس کے پاس پانی کا پیالہ رکھ جاتا تھا۔ کئی بار کوئی اسکے سرہانے روٹی کے ٹکڑے رکھ دیتا تھا۔ کسی خدا ترس نے پھٹی ہوئی گدڑی ایک چھپر کے نیچے رکھ دی تھی۔ پگلی روزانہ رات کو وہاں جا کر پڑ رہتی تھی۔ پگلی بھاگتی تھی اور ہنستی تھی۔ کسی بچے کو بھی بری بات نہیں کہتی تھی۔ کسی کی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتی تھی۔ زمین پر گری ہوئی کھانے کی چیز اٹھا لیتی تھی اور چاٹ لیتی تھی۔

لیکن چند ہی دنوں میں سب نے دیکھا۔ پارو نے بھی حیران اور پریشان ہو کر دیکھا۔ پگلی کا پیٹ بڑھ رہا تھا۔ سارے گاؤں کی عورتیں شرم سے گڑ گئیں۔ پگلی نہ کچھ بولتی تھی نہ کہتی تھی۔ پگلی کا بدن دن بدن بھرتا جا رہا تھا۔ پسلیاں روز بروز تنتی جاتی تھیں۔ عورتوں کا جی چاہتا تھا کہ وہ پگلی کو کپڑے پہنا کر رکھیں۔ یا وہ پگلی کو کسی کوٹھڑی میں ڈال دیں۔ لیکن پگلی کو کچھ پتہ نہ تھا۔ وہ یونہی ہنستی رہتی تھی۔

وہ بے نام مرد ہو گا۔ وہ کیسا وحشی ہو گا جس نے ایسی پاگل عورت کا یہ حال کر دیا۔ سب عورتیں پھٹکار بھیجتی تھیں۔ سب کا دل خون کے آنسو روتا، پگلی جو حسین تھی نہ جوان تھی۔ جو گوشت کا بے ہوش لوتھڑا تھی۔ ہڈیوں کا ایک لڑکھڑاتا ڈھانچہ تھی۔ مردوں نے اسے بھی نوچ نوچ کر کھا لیا تھا۔ پارو بھی سوچ سوچ کر غم و غصے کی آگ میں جلنے لگتی۔

لیکن پگلی کا پیٹ سب باتوں سے بے نیاز دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔

صبح کا اندھیرا تھا، جس اندھیرے میں پارو روزانہ باہر جاتی تھی۔ پارو ابھی باہر کے راستے پر چلی ہی تھی کہ ایک درخت کے نیچے ایک آدمی کا جسم پڑا ہوا دکھائی دیا۔ پارو ڈر گئی لیکن اس کا دل اتنا چھوٹا نہیں تھا۔ وہ آہستہ آہستہ پڑے ہوئے جسم کی طرف بڑھی۔ اس کو پہچان لینا دشوار نہیں تھا۔ پگلی پتھر درخت کے نیچے پڑی ہوئی تھی۔ اس کے پاؤں کے پاس نئے پیدا ہوئے بچے کا جسم پڑا تھا جس کی نال بھی ناف سے لگی ہوئی تھی۔

پارو نے ایک لمبی آہ بھری اور وہ حیران رہ گئی۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں کپکپاہٹ دوڑ گئی۔ پھر جیسے اس کو ہوش نہ رہا الٹے پاؤں دوڑ کر رشید کو بلا لائی۔

ایک پھٹی ہوئی چادر پارو نے پگلی کے جسم پر ڈال دی۔ رشید نے پگلی کی نبض دیکھی نبض دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ موت کی مہر پگلی کے منہ پر لگی ہوئی تھی۔ بالوں کی ایک لٹ اس کے ماتھے پر جم گئی تھی۔ قدرت اپنی پوری دھڑکن کے ساتھ پگلی کے بچے میں دھڑک رہی تھی۔ بچے کے منہ میں دایاں انگوٹھا تھا۔

"یا اللہ!" رشید کے منہ سے نکلا اور اس نے چاقو سے بچے کی نال کاٹی۔

پارو نے اوڑھنی کے آنچل میں بچے کو لپیٹ لیا اور دونوں گھر واپس آ گئے۔

صبح کی دھندلی طرح سارے گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی۔ آٹا گوندھتی ہوئی عورتوں کے ہاتھوں سے پراتیں چھوٹ گئیں۔ جلتے تندور کو چھوڑ چھوڑ کر عورتیں بچے کو پارو کے گھر دیکھنے آ گئیں۔ روئی کی پونی کی طرح سفید اور نازک بچہ۔ پارو نے نہلا دھلا کر ایک کھڈے پر لٹا دیا تھا۔ گرم دودھ میں چھوٹی سی

کپڑے کی بتی بھگو بھگو کر اس کے ہونٹوں سے لگائی دیتی تھی بچہ ہوشیاری سے دودھ کی بوندیں چوس رہا تھا۔ جاوید اپنے ننھے مہمان کو اچک اچک کر دیکھتا تھا۔

"بہت نیک کام کیا ہے۔"

عورتیں آ آ کر کہتیں ترس کھا کر دعائیں دیتیں اور واپس لوٹ جاتیں۔

دو چار آدمیوں نے اکٹھا ہو کر پگلی کی لاش کو ٹھکانے لگا دیا۔

شام ہو گئی تھی۔ پارو بچے کو سنبھالنے میں لگی ہوئی تھی۔ رشید نے لالٹین کی بتی صاف کر کے روشن کی تو بچے نے دو موٹی موٹی ہوشیار آنکھوں سے لالٹین کی طرف دیکھا۔ ابھی اس کی کچی نظر ٹھہرتی نہ تھی۔ پھر وہ اپنے میں مگن ہو گیا۔ پارو کے دل میں خیال آنے لگے۔ پگلی کے کالوٹے جسم کو کس مرد نے ہاتھ لگایا ہوگا۔ جانے پگلی کی رضامندی سے جانے زبردستی...... اس مرد کو کبھی بھول کر بھی یاد نہ آیا کہ اس نے پگلی پر کیا قہر ڈھایا تھا۔ کبھی اس بھوکے مرد کو اپنے بچے کی یاد بھی نہ آئی جس نے اپنی امانت پگلی کو سونپی تھی۔ پگلی کو پتہ بھی نہ ہوگا کہ اس کے گھر ایک بچہ پیدا ہوگا۔ زچگی کے درد اس نے کیسے برداشت کئے ہوں گے۔ اس کے لئے کسی دائی کے دل میں رحم نہ آیا۔ رات کے اندھیرے میں وہ چیختی رہی ہوگی۔ کھلی ہوا کے فراٹے سے وہ لڑتی رہی ہوگی۔ ٹھنڈی زمین کی مٹی پر بلکتی رہی ہوگی۔ لیکن قدرت کے کڑے قانون کا باندھا ہوا بچہ سب درد برداشت کرتے ہوئے اپنے آپ باہر دنیا میں آ گیا ہوگا۔ مٹی پر گر پڑا ہوگا اور درد سے نڈھال پگلی کی جان نکل گئی ہوگی۔

خیالوں میں ڈوبے ڈوبے پارو کی آنکھ لگ گئی۔ پارو نے دیکھا کہ ایک تیز رفتار گھوڑی پر پارو کو ڈال کر رشید بھاگا جا رہا ہے۔ کسی باغ کی چھوٹی سی کوٹھڑی میں پارو کو دو تین دن رکھ کے رشید نے پارو کو گھر سے نکال دیا ہے۔ وہ پاگل ہو گئی

ہے۔ وہ گلیوں میں پھرنے لگی ہے۔ اس کے پیٹ میں ایک بچہ سرسرانے لگا ہے اور پھر..... پھر ایک دن ایک درخت کے سائے میں پارو کے یہاں بچہ پیدا ہوا جس کی شکل ہو بہو جاوید کی سی ہے۔ اس کا بچہ اس کی چھاتی سے لگا ہوا دودھ کے لئے رو رہا ہے، لیکن پارو کا دودھ اُتر نہیں رہا ہے۔

پارو ڈر کر جاگ اٹھی، سامنے کھٹولے پر اس کا نیا بچہ گھگھیا کر رو رہا تھا۔ پارو نے اٹھا کر چھاتی سے لگا لیا۔ پھر ڈر کر جاوید کا منہ دیکھا۔ جو قریب کی چارپائی پر تھوڑی دیر ہوئی سو گیا تھا۔ پھر پارو نے ڈرتے ڈرتے باہر چولھے کے پاس بیٹھے ہوئے رشید کو دیکھا۔ رشید ابھی تک پارو کو چھوڑ کر نہیں گیا تھا۔ نہ اس نے پارو کو گھر سے نکالا تھا۔ پارو اپنے گھر میں صحیح سلامت تھی۔ جاوید اس کا گھنگھریالے بالوں والا خوبصورت بیٹا تھا۔ اس کی گلی والی ممتا بھی اس کو چوری چھپے ملتی تھی..... پارو کی محبت کو بڑھاتی تھی۔ اب اس کا کنبہ اور بڑھ گیا۔ اس کے گھر میں خدا نے ایک اور بیٹا بھیج دیا۔ پارو نے جھک کر نئے بچے کا منہ چوم لیا۔ پھر پارو نے اٹھ کر تھوڑا سا سفید زیرہ کھایا۔ جاوید پورے دو برس پارو کا دودھ پیتا رہا تھا۔ ابھی دودھ چھوٹے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ پارو نے سنا تھا کہ سفید زیرہ کھانے سے دودھ اتر آتا ہے۔ پارو نے ننھے بچے کے منہ میں اپنی چھاتی دے دی۔

تین دن بھی نہیں گزرے کہ پارو کی چھاتیوں میں سچ مچ دودھ اتر آیا۔ گاؤں کی عورتیں دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی تھیں۔ بچہ پارو کا چھوٹا بیٹا بن کر پرورش پانے لگا۔

اکٹھے رکھے ہوئے اپلوں میں جیسے دھیرے دھیرے آگ سلگتی ہے۔ گاؤں میں سرگوشیاں ہونے لگی تھیں۔ پگلی ہندو تھی۔ اس کے بچے کو مسلمانوں نے سنبھال لیا ہے۔ پورے گاؤں کے دیکھتے دیکھتے مسلمان بنا لیا ہے۔

جیسے بلی اپنے بچے کو جگہ جگہ اٹھائے پھرتی ہے۔ پارو بچے کو سینے سے لگائے ہوئے پچھلے کمرے میں چھپ چھپ کر بیٹھتی تھی۔ جیسے اس کے کانوں تک پہنچ جاتی تھیں۔ پہلے تو ایک دو ہندو گھروں میں مشورے ہوتے رہے۔

''یہ بات سچ ہے کہ پگلی ہندو تھی'' کوئی کہتا۔

''ہم نے سنا ہے کہ وہ لالہ موسی کے ایک خوش حال گھرانے کی بیٹی تھی، اچھی بھلی تھی۔ اس کی سوت نے اسے کچھ کر کے کھلا دیا تھا۔ اس دن سے وہ پاگل ہو گئی تھی۔''

''یہ تو سنی سنائی باتیں ہیں۔ لیکن میں نے خود اس کے بائیں ہاتھ پر ''اوم'' گدا ہوا دیکھا ہے۔'' کوئی آدمی زمین پر ہاتھ مار کر کہتا۔

''اندھیر ہے، یارو! ہمارے دیکھتے دیکھتے مسلمانوں نے ہماری آنکھوں میں دھول جھونک دی۔''

''لعنت ہے، ہم پر..... ہندو بچے کو انہوں نے پل بھر میں ہی مسلمان بنا لیا۔''

"چھوڑو، یارو! پتہ نہیں کس کی بلا ہے اور کس کی نہیں۔ ہم اس پلے کو کہاں باندھیں گے۔" کوئی آدمی درمیان میں بول اٹھتا۔

"نالائق! اس وقت دھرم کا سوال ہے۔ اس طرح تو وہ کل سارے گاؤں کو مسلمان بنالیں گے اور ہم منھ دیکھتے رہ جائیں گے۔" ایک دو آدمی ایک ساتھ اونچی آواز میں بول پڑے۔

"ہم بچے کو واپس لیں گے، دیکھیں گے، کون ہمارا ہاتھ پکڑے گا۔"

"بات تو صرف کچھ روپے ہی کی ہے نا......" جینوری کو چندہ اکٹھا کر کے دیں گے وہ خود بچے کو پال لے گی۔ کوئی آدمی جوش میں زمین پر آگے کو سرک کر کہتا۔

"ایسے گئے گزرے تو نہیں، سارے گاؤں سے ایک بچہ نہیں پل سکتا؟"

"پتہ نہیں، بچہ بھی پگلی کی طرح گونگا اور بہرا نکلتا ہے یا......" درمیان میں پھر کوئی آدمی بول اٹھتا۔

"تو کیا ہے؟ بڑا ہو کر دھرم شالہ میں جھاڑو لگا دیا کرے گا۔ دو روٹیاں ہی کھانی ہیں۔"

پھر وہ ایک دوسرے کی دلیری پر پیٹھ ٹھونکتے اور خوش ہوتے۔

"پہلے جھینوری سے تو پوچھ لو۔"

"وہ کیسے نہ رکھے گی۔؟ چاندی کا جوتا اس کے سر پر رکھیں گے پھر بچے کے بارے میں بات کریں گے۔"

"ارے، بچے کا کیا ہے، دھرم شالہ میں مویشیوں کی دیکھ بھال ہی کا کام آتا ہے۔ مفت کا خدمت گار مل جائے گا۔"

"سوت نہ کپاس...... ارے، ابھی بچہ بڑا تو ہولے، پہلے اس کا......"

"ارے مرے کیوں جاتے ہو، اگر تم دھرم کے نام پر یہ بھی نہیں کر سکتے تو بھاڑ میں جاؤ۔"

"تمہارے کھیت کا پانی کوئی اپنے کھیت کو لگا لے تو تم اس کا سر پھاڑ دیتے ہو آج وہ تمہارے ہندوؤں کا بچہ اٹھا کر لے گئے تو تمہارے منھ بند ہو گئے۔"

غرض کہ اسی طرح سرگوشیاں اور صلاح مشورے ہوتے رہے۔

اب رشید جب اپنے کھیتوں میں جاتا۔ قریب سے جاتے ہوئے ہندو اسے سخت نگاہوں سے دیکھتے۔ رشید بے پروا نکلا چلا جاتا لیکن ایک دو بار رشید نے دبے طور پر پارو سے کہا "گاؤں کی فضا اچھی نہیں، ہمیں اس جھگڑے سے کیا لینا ہے، اونچ نیچ ہو جائے گی۔ اگر لے جانا چاہیں تو بچہ لے جائیں۔ بچے کی جو قسمت ہے، ہو جائے گا۔"

پارو کچھ نہ کہتی، لیکن وہ بے چین ہو جاتی، کیونکہ اس نے ہڈیوں کے ڈھانچے کو دن رات سینے سے لگائے لگائے چھ مہینے کا کر لیا تھا۔ اب وہ بھی جاوید کی طرح گول مٹول ہوتا جا رہا تھا۔ پارو کو پہچاننے لگا تھا جس جس طرف پارو ہوتی، اس اس طرف اس کی آنکھیں گھوم جاتیں، وہ رشید کو دیکھ کر بھی ہمکتا تھا...... پارو سوچتی "پہلے ہی دن ہندوؤں کو خیال کیوں نہیں آیا۔ اُسے لے جاتے، پال لیتے، اسے ماں کی گود دیتے، اسے باپ کا پیار دیتے۔ پورے چھ مہینے میں نے راتیں جاگ کر گزاری۔ زیرہ کھا کھا کر اپنی چھاتیوں میں دودھ اتارا...... اس کی گندگی دھو دھو کر اپنے ناخن گھسا لئے۔ پھر پارو کو خیال آتا تھا" میں نے خود بچے کو شہد کی گھٹی دی تھی اور اپنے پڑوس کے مسلمان گھروں میں پنجیری بانٹی تھی۔ تاکہ بچے کو بڑے ہو کر کسی وقت یہ خیال نہ آئے کہ اس کا کسی

نے کچھ بھی نہ کیا تھا۔"

لیکن ایک دن آخر کار گاؤں کے بڑے بڑے ہندوؤں نے رشید کو بلوا لیا پارو کے ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئیں۔ وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی۔ سب کچھ تو میں نے کیا ہے اور برا بھلا رشید کو کہیں گے۔ اس کی کیوں بے عزتی کریں گے...... اس نے اصرار کیا کہ وہ بھی رشید کے ساتھ جائے گی اور ان کے سوالوں کا جواب دے گی۔ وہ خود جا کر بچے کی بھیک مانگ لے گی...... لیکن رشید نہ مانا اور اکیلا ہی جہاں اُسے بلوایا تھا، چلا گیا۔

گاؤں کے ایک ہندو چودھری کے صحن میں تین چار چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ جن پر گاؤں کے چیدہ چیدہ ہندو جاٹ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ رشید دو چار ساتھیوں کو ساتھ لے کر آئے گا یا شاید بالکل ہی نہ آئے۔ پھر وہ دوسرے طریقے سے رشید سے نبٹیں گے۔ لیکن رشید تنہا ہی وہاں چلا آیا۔ سلام ودعا کے بعد اُن کے سامنے بیٹھ گیا۔

"کیوں بھائی کیا ارادہ ہے تیرا؟ بچہ واپس دینا ہے یا نہیں۔" حقے کی منہ سے لگا کر ایک ہندو نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

"میری کیا مجال ہے؟ اللہ کی ذات ہے، میں کون ہوں دینے اور لینے والا؟" رشید نے ایک ہاتھ ماتھے کو لگایا اور آسمان کی جانب دیکھنے لگا۔

"یہ تو ہوئیں چکنی چپڑی باتیں، سیدھی طرح بات کر۔" ایک ہندو نے طیش میں آکر کہا۔

"میں تو اللہ کے رحم پر اُسے اٹھا لایا تھا۔ وہاں دو گھڑی دیر سے جاتا تو شاید کوئی کتا یا بلا اٹھا لے جاتا، لیکن اس کی عمر اللہ کی جانب سے بڑھی ہوئی تھی۔"

"ٹھیک ہے، اگر خدا کی طرف سے بڑھی ہوئی ہے تو کوئی توڑ نہیں سکتا۔

لیکن تجھے پتہ ہونا چاہئے کہ اس کی ماں ہندو تھی۔ ایک ہندو کے بچے کو اٹھا لے جانا ہم برداشت نہیں کر سکتے۔"

"بھلے آدمیو! مجھے پتہ نہیں، وہ ہندو تھی یا کون تھی، وہ ہندو گھروں سے بھی کھاتی تھی اور مسلمان گھروں سے بھی ......" رشید کہہ رہا تھا۔

"لیکن وہ تو پاگل تھی، تو تو پاگل نہیں" درمیان ہی میں ایک آدمی بات کاٹ کر بول پڑا۔

"ٹھیک ہے، لیکن تم پہلے ہی دن بچے کو لے لیتے، پال لیتے، میں نے منع تو نہیں کیا تھا۔ مٹھی بھر ہڈیاں تھیں۔ میری گھر والی نے پہر پہر کر کے چھ مہینے گزارے ہیں۔ اب بچہ بچ گیا ہے تو تمہیں بھی اس کی یاد آ گئی ہے۔ اللہ سے ڈرو، خدا ترسی کے طور پر تم پالو گے اور خدا ترسی کے طور پر میں پال رہا ہوں اور مجھے کیا لینا دینا ہے۔" رشید نے کچھ اس طرح کہا کہ دو تین آدمیوں کے چہرے سے یہی ظاہر ہوا کہ جانے دو، اگر پال رہا ہے تو پالنے دو۔ مفت کی بلا گلے ڈالے رکھے۔

"دیکھ، ہم بات بڑھانا نہیں چاہتے۔ نہ وہ ہمارا کچھ لگتا ہے، نہ تمہارا کچھ لگتا ہے۔ یہ تو دھرم کی بات ہے۔ دھرم کے راستے میں رکاوٹ نہیں بننا چاہئے۔ یونہی تو اپنے لئے خطرہ مول لے گا۔ کسی نے کوئی بری بھلی کر دی تو ہم ذمہ دار نہیں۔ اگر تو بھلا چاہے تو خود ہی بچے کو واپس کر دے۔ اگر اتنے دن پالنے پوسنے کا کچھ لینا ہے تو لے لے،" ایک چودھری نے کہا۔

"اللہ ...... اللہ ......" رشید نے دونوں ہاتھ کانوں کو لگائے۔

"جھینوری کی گھڑی ہوئی ہے۔ تیرے ساتھ ہمارے تین آدمی جا کر اور بچے کو تیرے گھر سے لے آتے ہیں۔ ہم خود اسے شدھ کریں گے۔"

"میں ایک بار تم سب لوگوں کی منت کرتا ہوں کہ اس بے چارے پر رحم کرو۔ وہ جہاں ہے، اسے وہیں رہنے دو، میری گھر والی اسے اپنے بیٹے کی طرح پال رہی ہے۔" رشید نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"ہم نے تجھے سیدھی بات بتا دی ہے، اگر تو خیریت چاہتا ہے تو ٹھیک طور سے چلا چل۔ ورنہ ہم جانتے ہیں کہ سیدھی انگلیوں سے گھی نہیں نکلتا ہے۔"

دو تین آدمی چارپائیوں سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ چادر اوڑھے ہوئے اندر کے کمرے سے جھنوری آ گئی۔ رشید کو کھڑا ہونا پڑا۔ لوگ رشید کے گھر کی طرف چل پڑے۔ پارو اپنے دروازے پر کھڑی گلی کی آہٹیں سن رہی تھی۔ جونہی اس نے رشید کا نیچا سر اور اس کے ساتھ تین چار آدمیوں کو آتے دیکھا، پارو کا دل بیٹھ گیا۔ آج پارو کو اپنے وہ دن سامنے دکھائی دیئے۔ جب اس کی ماں اس سے الگ ہو گئی تھی۔ جس دن اس کا باپ اس سے دور ہو گیا تھا۔ جس دن اس کے بہن بھائی اس سے بچھڑ گئے تھے۔ یہ بچہ بھی اس کے جسم کا حصہ تھا۔ اس حصے کے الگ ہونے سے بھی اسے ہی درد ہوتا۔ پارو نے دوڑ کے بچے کو سینے سے چمٹا لیا۔ رشید اپنے صحن میں آ کر ایسے کھڑا ہو گیا، جیسے کوئی راستہ بھولا ہوا آدمی ہوتا ہے۔

نہ رشید کو کچھ کہنے کی ضرورت تھی نہ پارو کو کچھ پوچھنے کی۔

جھنوری بھی لحہ بھر ٹھٹھک گئی۔ پارو کے سینے سے بچے کو الگ کرنا اُسے بہت دشوار محسوس ہوا۔

"جلدی کر، دیر ہو رہی ہے، ہمیں کام کاج کرنا ہے۔" ساتھ والے آدمیوں نے تلخی سے کہا۔

جھنوری نے دونوں ہاتھ بڑھا کے پارو کی گود سے بچے کو لے لیا۔ بچے کی مٹھی پارو کے آنچل کو پکڑے ہوئے تھی۔ پارو کو ایسا محسوس ہوا جیسے بچہ اس کے کلیجے میں سے مٹھی بھر کے کچھ نکال رہا ہو۔ پارو کا آنچل کھنچتا چلا گیا۔ جھنوری نے بچے کی مٹھی کھول کر آنچل چھڑا دیا۔

بچہ بلک اٹھا، شاید اجنبی ہاتھ لگنے سے۔

پارو ٹوٹی ہوئی ٹہنی کی طرح دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔ گلی کے موڑ سے اب بھی بچے کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔

شام تک پارو کی چھاتی سے دودھ رستا رہا اور اس کی قمیص گیلی ہو گئی۔ پارو کو یقین تھا بچہ ضرور بھوک سے بلکتا ہو گا۔ اسی لئے اس کا دودھ دھار بن کر گر رہا ہے۔

رات پارو کے یہاں نہ کھانا پکا نہ کسی نے کچھ کھایا۔ جاوید نے معصومیت سے پوچھا "ابا! ہمارے ننھے کو کہاں لے گئے ہیں؟ ابا! ہمارا ننھا کب آئے گا؟"

پارو اور رشید لاجواب سے جاوید کی طرف دیکھ کر اور شرمندہ ہو کر خاموش ہو گئے۔

پارو کی آنکھوں کے سامنے کمو کی صورت آتی کبھی بچے صورت آتی۔ رہ رہ کر سوچتی کہ وہ کیوں ٹوٹے ہوئے پھولوں کو گلے لگا لگا کے رکھتی ہے۔ ٹوٹی ہوئی کلیوں کو پانی کے چھینٹے دے دے کر کیوں رکھتی ہے۔ کوئی بھی اس کا اپنا نہیں بنتا۔ سب ہی اس کے بیگانے ہیں۔ پھر رہ رہ کر اس کو رشید کی صورت اچھی معلوم ہوتی۔ ایک وہ ہی اس سے نبھا رہا ہے۔ حالانکہ سب سے چھڑانے والا بھی وہی ہے۔ پھر بھی وہ اس کا اپنا ہے۔ اس کے جاوید کا باپ ہے۔

دوسری صبح...... تیسری صبح گزر گئی۔ اس سے اگلے تیسرے دن گاؤں میں یہی چرچا تھا کہ بچہ نہیں بچے گا۔ بچہ تو مرنے کے قریب ہے۔ بچے کا تو حال ہی کچھ نہیں، دودھ کا تو گھونٹ اس کے پیٹ میں جاتا ہے وہ باہر نکل جاتا ہے۔ پارو دیواروں سے لگ کر روتی تھی۔ اس کی چھاتیاں دودھ جمع ہو جانے سے بھر گئی تھیں۔ بچے کا منہ دودھ سے ہٹ گیا۔ بچے کے منہ اور دودھ میں بڑا فاصلہ حائل ہو گیا تھا۔

پارو ہر آہٹ پر چونک اٹھتی۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ دوڑی دوڑی دھرم شالہ جائے اور ان کی منت کرے کہ یوں ایک بچے کی زندگی کا خون نہ کرو۔ بچے کو میری جھولی میں ڈال دو۔ بچہ اچھا ہو جائے گا۔ لیکن پارو کو جرأت نہ ہوتی۔ اس کو امید نہیں تھی کہ مذہب کے پتھریلے کان اس کی منت کو سن لیں گے۔

......اس سے اگلے دن تک بھی کوئی بات سنائی نہ دی، اچانک رشید کے صحن میں دو تین آدمی آ کھڑے ہوئے۔ ''یہ لو اس کی جان تمہارے ہی حوالے ہے۔ اگر بچتا ہے تو بچا لو۔'' انہوں نے سفید کپڑے میں لپٹا ہوا، زرد اور بے ہوش بچہ رشید کی گود میں ڈال دیا۔

ایک بار تو رشید کے دل میں آیا کہ وہ ایک تھپڑ زور سے ان کے منہ پر مارے ''میری چھ مہینے کی خدمت کے عوض تم لوگ چاندی کے چند سکے دے رہے تھے۔ اب اسے قبر کے کنارے پہنچا کر میرے حوالے کرتے ہو۔ جاؤ، جہاں جی چاہے لے جاؤ۔''

لیکن پارو کا کھلا ہوا چہرہ دیکھ کر رشید غصے کو پی گیا۔

ایک ہفتے کے اندر اندر سارے گاؤں نے دیکھا کہ بچہ پارو کے صحن میں اچھا بھلا کھیل رہا ہے۔

رحیم کی بوڑھی ماں کی نظر کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ رحیم کی ایک بیوی سات مہینے کی بچی چھوڑ کر مر گئی تھی۔ اس کی دوسری بیوی کی ساس سے بہت کم بنتی تھی۔ اس لئے رحیم کی ماں نظر کی کمزوری کو اور بھی زیادہ محسوس کرتی تھی۔ ابھی تک اس کی نظر ٹھیک رہی تھی۔ وہ رسوئی کے سب کام کرتی تھی۔ اس نے پرانی روئی کات کات کر دریوں سے ٹرنک بھر ڈالے تھے۔ سوت کات کات کر چادریں اور کھیسوں سے گھر بھر چھوڑا تھا۔ ابھی تک وہ اپنے بوڑھے ہاتھوں سے دانے صاف کر لیتی تھی۔ آٹا پیس لیتی تھی۔ کپاس بیل لیتی تھی۔ دودھ بلو لیتی تھی۔ پھر بھی اس کی بہو باتیں سناتی رہتی تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ اگر وہ آنکھوں سے محتاج ہو گئی تو اس کو کوئی پانی کو بھی نہ پوچھے گا۔

دن رات کڑھتی ہوئی رحیم کی ماں نے ایک دن پارو سے کہا کہ اگر وہ پندرہ دن کے لئے اس کے ساتھ چلے تو وہ اپنی آنکھوں کا علاج کرا لے شاید اس کی نظر ٹھیک ہو جائے۔

''اماں، وہ حکیم کہاں رہتا ہے؟'' پارو نے پوچھا۔

''حکیم کہیں نہیں ہے، بیٹی، ایک باؤلی ہے۔ اس باؤلی پر خدا کا خاص کرم ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کے پانی سے ہر روز صبح نماز پڑھ کے آنکھیں دھوئیں تو تھوڑے ہی دنوں میں آنکھیں ٹھیک ہو جاتی ہیں۔ سنا ہے کہ وہاں کئی لوگوں کی بند آنکھیں بھی کھل گئی ہیں۔ باؤلی کی مٹی بھی آنکھوں کو لگاتے ہیں۔''

''کہاں ہے، اماں! وہ باؤلی؟''

"رتو وال گاؤں میں، ایک فقیر وہاں رہتے ہیں۔ مریضوں کے لئے اس باؤلی کے پاس خیمے لگوائے گئے ہیں۔"

پارو کے کانوں میں جیسے کسی نے تنکے چبھو دیئے ہوں۔ "رتو وال..... رتو وال۔" چھتو وانی کے کھیتوں میں کھڑے ہو کر جس رتو وال کو جانے والی کچی سڑک کا منہ دیکھا کرتی تھی۔ جس سڑک سے پارو کو لینے کے لئے کسی کو گھوڑی پر چڑھا کر آنا تھا۔ جس سڑک سے گاؤں کے چار کہاروں کو پارو کا ڈولا لے کر گزرنا تھا......رتو وال......رتو وال......

پارو کے پاؤں سے وہ راستہ کبھی میلا نہ ہوا۔ پارو نے آنکھوں سے کبھی وہ گاؤں نہ دیکھا۔ پارو کو ایک بھولا ہوا نام یاد آیا۔ "رام چند"...... "رام چند"...... پارو کے دل سے دھواں اٹھا...... پارو حسرتوں سے بھر گئی۔ ایک بار اس کا منہ تو دیکھوں۔ کیسا ہے! ایک بار اس کا گاؤں تو دیکھو کیسا ہے!

"اچھا، اماں! میں تیرے ساتھ چلوں گی۔" پارو نے آہستہ سے کہا۔ پھر شرمندہ سی ہو کر رحیم کی ماں کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے محسوس ہوا، جیسے رحیم کی ماں نے اس کے دل کی بات سمجھ لی ہو۔

"خدا کرے بچے جئیں۔ دودھ اور پوت بڑھے۔" رحیم کی ماں کے دل سے دعائیں نکلیں۔ اس کے دل میں ہوک اٹھی کاش اس کی اپنی بہو بھی کبھی اتنی میٹھا بول سکتی۔

"اماں، جاوید کے ابا کو منا لینا، میں نہیں کہوں گی۔" پارو نے شرم محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"لے، دیکھ، وہ میرا بیٹا ہے۔ وہ کبھی انکار کر سکتا ہے۔ میرے لئے چار دن دشواری سے گزار لے گا۔" بڑے دعوے سے رحیم کی ماں نے کہا۔

پارو اچھی طرح جانتی تھی کہ رشید کبھی اس کی بات ٹالتا نہیں ہے۔ لیکن رشید کے سامنے رتو وال کا نام لینا ہی پارو کے لئے مشکل تھا۔

اس رات پارو کے دل میں مختلف خیالات ابھرتے رہے۔ وہ میرا کون ہوتا ہے۔ میں تو آنکھ اٹھا کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھوں گی۔ غیر آدمی...... مجھے اس کے گاؤں سے کیا...... گاؤں میں رہتا ہے، تو رہے، اماں اپنا علاج کرے گی اور ہم واپس آ جائیں گے...... پگلی، تیرے ہی دل میں بار بار اس کے خیال آتے ہیں۔ اس کو تو ایک برے خواب کی طرح بھی تیری یاد نہ آتی ہوگی۔ پارو سوچتی اس گاؤں میں جا کر رات ہوتے ہی اس کے دل میں جیسے کوئی دبی ہوئی قبروں کو کھود ڈالے گا۔ اس کے دل میں جیسے کوئی مردوں کو جگائے گا۔ ان کفنوں کو اتار کر کیا لینا ہے۔ وہ رتو وال نہ جائے گی۔ وہ رتو وال کے راستے ہی سے نہ گزرے گی۔ پارو کی زبان سے نہ ہاں نکلی نہ نا۔

جاوید باپ سے پل بھر بھی جدا نہیں رہتا تھا۔ رشید نے اس کو ساتھ نہ بھیجا۔ دونوں عورتوں کو پہنچانے کے لئے رحیم کا ایک پرانا مزدور ساتھ گیا۔ پارو چھوٹے بچے کو ساتھ لے گئی۔ ان کا مزدور یکے پر کوچوان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ سب چھوٹی بڑی چیزیں سنبھال کر پارو اور رحیم کی ماں آمنے سامنے بیٹھ گئیں۔ یکے کے پہلے ہی ہچکولے سے پارو کا بچہ اس کی گود میں سو گیا۔ آگے بیٹھے ہوئے مزدور نے پارو کے بچے کو گود میں لے لیا اور یکہ رتو وال کے راستے پر چل پڑا۔ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز پارو کے دماغ کی رگوں سے ٹکراتی تھی۔ پارو نے ماتھا یکہ کی بانہہ سے لگا لیا اور وہ سپنا دیکھنے لگی۔

...... سجے ہوئے ڈولے میں چاندی کے تختے والا تکیہ سر سے لگا کے پڑی ہوئی ہے۔ چوڑے کے بوجھ سے اس کی بانہیں نہیں اٹھتیں۔ ہوا کے ایک

جھونکے سے ڈولے کا پردا ذرا سا سرکا۔ مدھم سی روشنی میں پارو نے دیکھا۔ اس کے ہاتھوں میں مہندی رچی ہوئی ہے۔ کتنی اچھی مہندی تھی۔ پارو کی سہیلیوں نے کتنی کتنی مہندی لگا دی ہے۔ کم بخت کہار چلتے بھی کس طرح ہیں۔ ڈولے میں بیٹھے بیٹھے پارو کے پہلو تھک گئے ہیں۔ ڈولے کو کتنے ہچکولے لگتے ہیں..... پارو کے کندھے ہوئے سر سے آنچل ڈھلک گیا۔ پارو نے ہاتھ اٹھا کر آنچل سر پر ٹھیک کر لیا۔ ہاتھوں کی چوڑیاں کی جھنکار ڈولے میں گونج اٹھی۔

پارو کندھے سے پکڑ کر اماں ہلا رہی تھی۔ "دوپہر ہو گئی ہے، کچھ کھا لے۔"

یکے والے نے یکہ روکا ہوا تھا۔ راستے کے ایک چھوٹے سے گاؤں کے قریب رک کر سب کو کھانا پینا تھا۔ پارو ڈر کر جاگ اٹھی۔ نہ ڈولا تھا۔ نہ زیور تھے۔ نہ مہندی تھی نہ چوڑا تھا۔ پارو خالی خولی یکے کے پچھلے تختے پر اماں کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔

پارو نے پراٹھے بنا کر راستے کے لئے رکھ لئے تھے۔ اماں نے گٹھری کھولی۔ مزدور کو چار پراٹھے دیئے۔ یکے والے کو دیئے۔ خود لئے اور پارو کے سامنے رکھ دیئے۔ پارو کے گلے سے لقمہ نہیں اترتا تھا۔ پراٹھے کا گھی پارو کو دل کو متلا رہا تھا۔

"تھوڑا ہی فاصلہ رہ گیا ہے۔ جلدی جلدی سفر طے کر لیں۔ رات میں گھوڑی کو آرام دے کر مجھے واپس جانا ہے۔" یکے والا کہہ رہا تھا۔ پھر اسی طرح سب لوگ یکے میں بیٹھ گئے۔ پارو نے یکے کی بانہہ سے ٹکا لیا۔ پارو پچھلی رات جاگ کر آنے کے لئے تیاری کرتی رہی تھی وہ رات بھر جاگی تھی۔

......ڈولا پھر ہچکولے کھانے لگا۔ رتو وال کا راستہ ختم ہونے میں نہیں آتا

تھا۔ یکا یک باجے اور طوطی کی آواز بہت اونچی ہو گئی۔ ڈولے کے اردگرد باجے ہی باجے بج رہے تھے۔ پارو کو محسوس ہوا کہ وہ رتو وال پہنچ گئی ہے..... باجے اور اونچی آواز سے بجنے لگے۔ لڑکیاں گا رہی ہیں..... ایک عورت نے اس کا گھونگھٹ اٹھایا..... پھر کسی نے ایک چھوٹا سا بچہ اس کی گود میں ڈال دیا۔ بچہ اس کی اجنبی گود میں رو رہا ہے۔ عورتیں کھل کھلا کر ہنس رہی ہیں۔ وہ بچے کا شگن کر رہی ہیں۔

اماں اس کو کندھے سے پکڑ کر ہلا رہی تھی۔ "آج تجھے کتنی نیند آئی ہے۔ بچہ رو رہا ہے۔"

پارو پھر ڈر کر جاگ اٹھی۔ یکے کے پیچھے تختے پر بیٹھی ہوئی اماں اس سے بات کر رہی تھی۔

"ہمارے قریب سے اتنی بڑی برات گزری ہے، باجے ہی باجے بج رہے تھے۔ تم جاگی ہی نہیں۔" مزدور کہہ رہا تھا۔

"تجھے سوتے ہوئے بچہ پکڑایا تو نے بچے کو بھی پکڑ لیا۔ پھر بھی تیری نیند نہیں کھلی۔" اماں کہتے کہتے ہنس پڑی۔

یکہ رتو وال کے قریب پہنچ گیا تھا..... سب لوگ باؤلی کے قریب یکے سے اترے۔ سامنے ہی سائیں کا کمرہ تھا۔ خیموں کی جگہ سائیں نے دو تین کچے کمرے بنوا لئے تھے جن میں دور سے آئے ہوئے مسافر رہتے تھے۔ باؤلی کی مٹی اور باؤلی کا پانی آنکھوں سے لگاتے تھے، مرادیں پاتے تھے۔

سائیں نے ان نئے مسافروں کو ایک کمرہ دے دیا۔ مزدور نے سب سامان کمرے میں رکھا اور اماں کو لے کر سائیں کے پاس چلا گیا۔ پارو نے

کمرے میں پڑی ہوئی بان کی چارپائی پر کھیس بچھا کر بچے کو لٹا دیا۔ پھر وہ کمرے کے دروازے میں کھڑی ہو کر سامنے کھیتوں کے پار گاؤں کے گھروں کی طرف دیکھنے لگی۔

''...... میں رتو وال آ گئی، مجھے کسی نے بلاوا نہیں بھیجا۔ مجھے کوئی بھی لینے نہیں گیا۔ کسی نے بھی شہنائی نہ بجائی۔ کسی نے بھی میرے ہاتھوں میں چوڑیاں نہ پہنائیں۔ مہندی کا ایک پتا بھی میرے ہاتھوں پر نہ لگا...... گاؤں کے باہر کی باؤلی کا سناٹا پارو کو کھا رہا تھا۔ پارو کا جی چاہتا تھا کہ وہ اس گاؤں سے بھاگ جائے۔ رہ رہ کر پارو تلملا اٹھتی تھی۔ کتنے ناقدرے لوگ ہیں، اس گاؤں کے...... کوئی اسے بیٹھنے کے لئے بھی نہیں کہتا۔ کوئی اسے نہیں کہتا، جیتی رہو۔ کوئی اسے نہیں کہتا......

پارو پھر کچھ سنبھلی، اس کو محسوس ہونے لگا کہ وہ پاگل ہوتی جا رہی ہے۔ کہیں وہ پگلی کی طرح گاؤں کی گلیوں میں نہ دوڑنے لگے۔ کہیں وہ اپنے کپڑے نہ پھاڑ ڈالے، کہیں وہ اونچی آواز میں نہ بولنے لگے۔

اماں کو سائیں نے بتایا کہ اسے پورے تیرہ دن وہاں رہنا ہوگا۔ ان کا مزدور دوسرے دن سکڑیا لے واپس چلا گیا۔ آٹا دال وغیرہ وہ ساتھ لے آئی تھیں۔ پارو اور اماں اپنی روٹیاں پکاتی تھیں۔ ویسے کوئی چاہے تو سائیں کی درگاہ میں بھی روٹی کھا سکتا تھا۔

پارو نے گاؤں کی طرف منہ بھی نہ کیا۔ پارو گاؤں کی بات بھی کس سے پوچھتی۔ پوچھتی تو کیا پوچھتی۔ ایک دن کے بعد دوسرا دن گزر جاتا تھا۔ گاؤں میں جاتی بھی تو کس بہانے سے۔ کسی چیز کی ضرورت ہوتی تھی تو سائیں کے خدمت گار وہیں لا دیتے تھے۔ پارو کو سوچ کر بھی خوف ہوتا تھا کہ جی چاہتا تھا کہ

کسی نہ کسی طرح جا کر وہ سارا گاؤں دیکھ آئے۔ اس کا گھر بھی دیکھ آئے، اسے بھی دیکھ آئے۔ لیکن اسے کوئی نہ پہچانے...... پھر پارو سوچتی کہ اسے کیسے پتہ لگے گا کہ اس کا گھر کون سا ہے۔ وہ کسی سے کیسے پوچھے گی۔ پھر گھر کو اندر سے کیسے دیکھ سکے گی...... پھر پارو سوچتی تھی کہ اسے گھر دیکھ کر لینا بھی کیا ہے۔ اس کا اس گھر سے تعلق بھی کیا ہے۔ کیوں اسے ایسے خیال آتے ہیں۔

پارو کا دل نہیں ٹھہرتا تھا۔ ایک دن کے بعد دوسرا دن گزر جاتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے پارو کے منہ سے بھولا ہوا ایک گیت نکل پڑا۔

جیہے آئے تھے ٹر چلے (جیسے آئے ویسے ہی چلے گئے)
ساڈے آیاں وا قدر نہیں (ہمارے آنے کی قدر بھی نہیں)
ہائے رباں! ساڈے آیاں وا صبر پوئی (ہائے خدا! ہمارے آنے کا صبر پڑے

کتنی بار پارو کی آنکھوں میں آنسو آئے۔ کتنی بار اس نے آنسو پیے۔ بچے کو اماں کے پاس لٹا کر وہ کھیتوں میں گھوم آتی تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ ایک بار دیکھوں تو پہچان تو لوں...... پھر وہ سوچتی تھی کہ اتنے برس تو ہو گئے ہیں۔ کیا پتہ ہے کیسی صورت اور شکل ہو گئی ہو۔ چاہے میرے پاس سے گزر جائے، مجھے اتنی کہاں پہچان ہے۔

کھیتوں میں کام کرتے ہوئے مزدوروں سے کبھی کبھی پارو پوچھ لیتی۔ ''بھائی یہ کس کے کھیت ہیں؟ دو گاجریں لینی تھیں۔ ہم تو مسافر ہیں۔'' مزدور کبھی کسی کا نام لیتے تھے، کبھی کسی کا نام...... رام چند کا نام کوئی بھی نہ لیتا تھا۔ دوسرے دن کسی مزدور نے سچ مچ رام چند کا نام لیا۔ پارو کے پاؤں جیسے زمین میں گڑ گئے ہوں، اس کے چکر کھاتے ہوئے سر کو محسوس ہوا کہ وہ وہیں زمین پر گر جائے گی۔ وہ اس مٹی پر مٹی ہو جائے گی۔ وہ اس کیکر کے درخت کے نیچے کھڑی کی کھڑی رہی۔ اس

کے پاؤں میں سے جیسے کسی نے سب طاقت کھینچ لی ہو۔اس کے پاؤں جیسے جم کر برف کے تودے ہوگئے ہوں۔اس مٹی نے جیسے اس کو مضبوطی سے پکڑ لیا ہو۔

پارو کو محسوس ہوا کہ وہ کھڑی کی کھڑی انار کا ایک بوٹا ہو کر وہاں اُگ آئی تھی جس کے سرخ اناروں کو جب بھی کوئی توڑنے لگتا وہ انگارے بن کر زمین پر گر پڑتے۔اس کے سرخ اناروں کو جب بھی رام چند توڑتا۔انار کے سرخ دانے لہو کے قطرے بن کر اس کی قمیص پر چپک پڑتے۔اس کو انار کے بوٹے میں سے ایک آواز آتی..... ''میں بوٹا اُگی ہوئی آں..... میں بے مرادی موئی ہاں۔'' (میں بوٹا بن کر اُگی ہوئی ہوں..... میں نامراد ہی مرگئی ہوں) مزدور نے کاٹے ہوئے چنے کا گٹھا باندھ سر پر اٹھالیا۔پارو کو ہوش آیا۔اس کو یاد آیا کہ جو شہزادی انار کا بوٹا بن کر اُگی تھی۔اس کی کہانی اس نے بچپن میں سنی تھی۔پارو بھی شہزادی بنی تھی نہ انار کا بوٹا۔

''مالک آ رہا ہے.....'' کہتے کہتے مزدور چنے کا گٹھا لے کر کنوئیں کی طرف چل پڑا۔پارو کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور نکلتے ہی رہے۔رام چند جب پارو کے پاس سے گزرا اس نے پارو کا چہرہ دیکھا۔جس پر آنسوؤں کی دھار بہہ رہی تھی۔پارو کو کیکر کے درخت کی آڑ میں ہو جانا یاد تھا نہ اپنے آنچل سے آنسو پونچھنے کا خیال تھا۔شاید آنسوؤں کے بہنے سے رام چند کا منھ بھی نہیں دکھائی دیتا تھا۔

''تو کون ہے؟ بی بی! تجھے کیا ہوا ہے؟'' رام چند کے پاؤں پارو کے سامنے رک گئے۔

پارو بول بھی نہ سکی۔

''تجھے کوئی تکلیف ہے؟ بی بی!'' پارو کے کانوں میں پھر رام چند کی آواز پڑی۔ پارو کی زبان جیسے کسی نے کھینچ رکھی ہو۔وہ بت کی بت بنی کھڑی رہی۔اس

کے دل میں بہت کچھ آیا۔لیکن اس کے منھ سے ایک حرف بھی نہ نکلا۔

رام چند ٹھٹھک گیا۔اس نے ادھر ادھر دیکھا۔شاید وہ کسی مزدور کو مدد کے لئے بلاتا۔لیکن پارو کے پاؤں میں طاقت واپس آ گئی اور وہ چپ کی چپ..... گم کی گم کھیتوں سے باہر چلی گئی۔

پارو بت کی بت اپنے کمرے میں آ کر پڑ گئی۔شام کو سکریالے سے ان کا مزدور آ گیا تھا۔دوسری صبح سب کو گاؤں واپس چلا جانا تھا۔اس رات پارو کی آنکھ نہ لگی۔''ایک بات بھی میں نے اس سے نہ کی'' ..... پوچھتا تھا، تو کون ہے؟ بی بی!'' میں اسے کیا بتاتی کہ میں کون ہوں..... مجھ پر بیتی ہوئی کون بتا سکتا ہے..... کبھی سوتے جاگتے اسے میری یاد آئے گی۔میرا روتا ہوا منھ یاد آئے گا۔وہ سوچے گا میں کون تھی، پھر شاید اسے بھولی ہوئی کہانی یاد آ جائے گی..... اس کی پارو اُسے یاد آ جائے گی..... پھر شاید اس کی آنکھوں سے ایک آنسو گر پڑے گا..... پھر پارو سوچتی، کبھی میں بھی اس شہزادی کی طرح انار کا بوٹا بن سکتی، وہ میرے اناروں کو توڑتا۔پھر میں اناروں میں سے بول اٹھتی۔پتہ نہیں کس زمانے کی باتیں ہیں..... آج کل تو کوئی آدمی بوٹا نہیں بنتا۔''

رات کا پچھلا پہر تھا۔ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔پارو جیسے کسی نے ہاتھ پکڑ کے [illegible] وہ باہر کھیتوں میں چلی گئی۔رات کے اندھیرے [illegible] چھپی تھی۔رات کے اندھیرے میں [illegible] [illegible] وقت رام چند اس کے سامنے [illegible] [illegible] پارو نے دونوں آنکھیں بند [illegible] نکال [illegible] آنکھوں سے لگے ہوئے پارو کے دونوں ہاتھ کسی نے اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔پارو نے چونک کر دیکھا۔رام چند اس کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

"کیا تو پارو ہے؟" رام چند پوچھ رہا تھا۔

"ساری رات میرے کانوں میں ایک ہی نام گونجتا رہا ہے، سچ بتا کیا تو پارو ہے؟"

پارو کا جی چاہتا تھا کہ وہ رام چند کے پاؤں پر گر پڑے۔ جی بھر کر روئے اور چیخ چیخ کر کہے کہ وہ پارو ہی ہے۔ وہ اسی کی پارو ہے، جس کو اُسے گھوڑی پر چڑھ کے لینے کے لئے جانا تھا۔ وہی پارو ہے جس کے ساتھ اسے پھیرے لینے تھے۔ وہ وہی پارو ہے جسے اس کے گھر ڈولے میں بیٹھ کر آنا تھا...... وہ پارو ہے پارو......"

پارو کی زبان کو آج بھی کسی نے کھینچ لیا۔ وہ ایک بھی بات نہ کہہ سکی۔ رام چند کے ہاتھوں میں سے اس نے اپنے دونوں ہاتھ چھڑا لئے۔ اور اسی طرح گم سم پیچھے مڑ گئی۔

"جو تو پارو ہے مجھے ایک بار بتا جا۔" رام چند نے پارو کے پیچھے تیز قدم سے چل کر کہا۔ "میں ساری رات کھیتوں میں رہا ہوں، میرا دل کہہ رہا تھا کہ تو پھر آئے گی۔ میرا دل کہتا ہے کہ تو پارو ہے۔"

"پارو کب کی مر گئی ہے" جانے کس طرح پارو کے منھ سے یہ بات نکلی۔ پارو نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ وہ آگے ہی آگے چلی گئی۔

اماں نے باؤلی کے سائیں کو اپنی توفیق بھر شیرینی چڑھائی اور اماں اور اس کے دوسرے ساتھیوں سے بھرا ہوا یکہ صبح کی دھوپ چڑھنے سے پہلے سکڑیالے کے راستے پر چل پڑا۔

ایک ایک کر کے کئی دن گزر گئے۔ دن دن کر کے مہینے اور مہینہ مہینہ کر کے سال گزر گئے۔

دودھ سے بھری ہوئی ہانڈی کو جب پارو دودھ پکانے کے لئے اپلوں پر رکھتی اور سارا دن جلنے کے لئے اپلوں میں ہلکی ہلکی آگ سلگتی رہتی اس وقت اس کو محسوس ہوتا تھا کہ اس کی چھاتی کے اندر ایک چنگاری تھی جس کی وجہ سے کئی دنوں سے اس کے اندر ہی اندر کچھ سلگتا رہتا تھا۔

ان ہی دنوں میں ایک دن جب رشید گھر آیا اس کا منھ اس طرح اترا ہوا تھا، جیسے کسی لمبی بیماری سے اس کے چہرے کی ہڈیاں نکل آئی ہوں۔

ساتھ ساتھ پڑی ہوئی چارپائیوں پر بیٹھ کر پارو نے رشید کی اداسی کا سبب پوچھا۔

"آج میرے گاؤں سے ایک آدمی آیا ہے۔ ہمارے اپنے کھیتوں کا آدمی۔" رشید نے تھوڑی دیر چپ رہ کر کہا۔

"چھتووانی سے؟"

"ہاں۔"

"پھر؟"

"اس نے بتایا ہے کہ ہماری کٹی ہوئی فصلوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے اور

منوں دانے پڑے ہوئے تھے......''

''پھر؟''

''کسی نے رات کو آگ لگا دی ہے۔''

''ہیں؟''

''ساری فصل میں سے ایک مٹھی دانہ بھی نہیں بچا۔''

''کسی نے جان بوجھ کر آگ لگائی ہے؟''

''ایسا کون تھا......؟''

رشید چپ رہا۔ پارو خیالوں میں ڈوب گئی۔ بچے سو رہے تھے۔ لیکن رشید اور پارو کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔

لیکن دوسرے کا گھر پھونک کر کسی کو کیا مل جاتا ہے، پارو نے کئی بار رہ رہ کر دل میں سوچا۔ رشید چپ رہا۔ پارو دیکھتی رہی۔ رشید کبھی یہ کروٹ بدلتا تھا کبھی وہ کروٹ۔ کئی بار آنکھیں بند کر کے بھی پڑا رہتا تھا۔ لیکن نیند اس کے قریب ہی نہ آتی تھی۔ کئی بار رشید نے چلو بھر بھر کے پانی پیا۔

''بچے کو الگ چارپائی پر لٹا دے۔ آج مجھے اس کے ساتھ نیند نہیں آ رہی ہے۔'' رشید نے ایک بار کہا۔

جاوید ہمیشہ باپ کے ساتھ سوتا تھا۔ چھوٹے بچے کو پارو اپنے ساتھ سلاتی تھی۔ پہلے کبھی رشید نے یوں نہ کہا تھا۔ آج پارو حیران ہوئی لیکن اس نے چپ چاپ جاوید کو اٹھا کر دوسری چارپائی پر لٹا دیا۔

پھر کتنی ہی دیر وقت گزر گیا۔ اور رشید کروٹ لیتے لیتے بھی تھک گیا۔ لیکن نیند رشید کی آنکھوں میں نہ آئی۔

''ایک اڑتی اڑتی بات سنی ہے، پتہ نہیں، سچ ہے کہ جھوٹ؟'' لیٹے لیٹے رشید

نے کہا۔

''کیا؟'' پارو نے چونک کر پوچھا۔

''سنا ہے، کہ گاؤں میں ایک اجنبی جوان آیا تھا۔ وہ کسی سے زیادہ ملا جلا نہیں۔ گاؤں کے ایک دو آدمیوں کو شبہ ہے کہ وہ تیرا بھائی تھا۔''

''میرا بھائی؟'' پارو ہڑبڑا کے بول اٹھی۔

''کچھ کہا نہیں جا سکتا، مجھے تو گاؤں گئے ہوئے بھی بہت عرصہ ہو گیا ہے اس آدمی کی زبانی یہ باتیں معلوم ہوئی ہیں۔'' رشید یہ کہہ کر چپ ہو رہا۔

پارو کا سر چکرانے لگا۔

''میرا بھائی؟...... میرا بھائی اب جوان ہو گیا ہوگا۔ دس گیارہ برس ہو گئے ہیں مجھے اس کی صورت دیکھے ہوئے۔ پتہ نہیں اب کیسی شکل ہے اس کی میں اچانک اسے دیکھ لوں تو پہچان بھی نہ سکوں۔''

رشید نے اسے صرف اتنا اور بتایا کہ پارو کے پرانے مکان کے بارے میں اس نے گاؤں کے کسی آدمی سے پوچھا تھا کہ یہ گھر کس کا ہے؟ لیکن اپنے بارے میں اس نے کسی کو اپنے منہ سے کچھ نہیں بتایا تھا۔ لوگوں کا محض شبہ ہی ہے، کسی نے اپنے کانوں سے کچھ بھی نہیں سنا تھا۔

''سچ! وہ گاؤں میں آیا ہوگا؟ اسے میں یاد آئی ہوں گی۔''

پارو اس لمحے لگی ہوئی آگ کا دکھ بھول گئی۔ جلی ہوئی گندم کی راکھ میں سے بھائی بہن کا پیار ابھر آیا۔ پیار کی ایک روشن چنگاری اس کے دل میں چمکنے لگی۔ پتہ نہیں اس نے آگ لگائی ہے پتہ نہیں اس نے اپنے دل کا غبار نکالنے کے لئے بدلہ لیا ہے اس کی جوان ہڈیوں میں نیا خون دورہ کرتا ہوگا۔ اسے بہن کا دکھ یاد آتا ہوگا...... میں ایک بار اس کا منہ دیکھ لوں......

''آگ لگانے والا کہیں وہ ہی نہ ہو...... چاہے کسی اور نے لگائی ہو، اور شک وشبہ میں وہ پکڑا جائے......'' پارو کے لئے یہ خیالات بہت بڑی تشویش کا باعث ہو گئے۔ کچھ بھی ہو، وہ بھائی کی خیریت چاہتی تھی۔ پارو سوچتی تھی پتہ نہیں اس کے بھائی کے دل میں دکھ اور پیار کی آگ لگی ہوئی تھی۔ اس لگی ہوئی آگ میں سے ایک دیا سلائی کھیتوں کو دکھا دی تھی۔

پارو نڈھال سی اپنی چارپائی پر لیٹ گئی اور رہٹ کی بالٹی کی طرح خیال اس کے دل میں گھومتے رہے۔

پارو کی آنکھ لگ گئی۔ ''آگ ہی آگ اس کو سامنے دکھائی دی، گھاس کے تنکے سے لے کر پیپلوں کی بلندی تک سب کچھ جل رہا تھا۔ پھر پارو نے خواب میں دیکھا ایک خوبصورت جوان لڑکا آگ کے جلتے ہوئے شعلوں کے پاس بیٹھ کر ہاتھ سینک رہا ہے۔

جیسے خربوزہ قاشیں قاشیں ہو جاتا ہے اسی طرح شہروں میں اور گاؤں میں لوگوں سے لوگ الگ ہوتے جا رہے تھے۔ جیسے کہ راستوں سے مٹی اڑ اڑ کر آتی ہے، یونہی قریب کے قصبوں سے خبریں آتی تھیں۔ آدمی مر رہے ہیں، مکان جل رہے ہیں۔ پڑوسی کو پڑوسی قتل کر رہا ہے۔ راہ چلتا، راہ چلتے کو ہلاک کر رہا ہے۔ لوگوں کی جانیں سلامت نہیں ہیں، لوگوں کے مال سلامت نہیں۔

پارو آنکھوں سے دیکھتی تھی اور کانوں سے سنتی تھی۔ اس کے اپنے گاؤں کے اردگرد کے گاؤں میں لوگ گھروں میں ہتھیار اکٹھا کر رہے تھے۔ لوگ اپنے ہتھیاروں کو تیز کر رہے تھے۔ لوگ گھروں کے کمروں میں اینٹیں بھر رہے تھے۔ لوگ کلہاڑیاں اور گنڈاسے سنبھال کر گھروں میں رکھ رہے تھے۔

'یہاں 'ہمارا' ناراج ہوگا۔ یہاں ہماری اپنی حکومت ہوگی۔' ہر آدمی کہتا تھا ہم یہاں ہندو کا نام ونشان تک نہ رہنے دیں گے۔ لوگ راستوں پر کھڑے ہو کر باتیں کرتے تھے۔

کبھی ایسا ہوتا بھی سنا ہے۔ پارو ہر وقت یہی سوچتی تھی۔ وہ رہ رہ کر سوچتی تھی۔

''یونہی لوگوں کو پاگل پن کا دورہ پڑتا ہے'' پارو کہتی تھی ''چار دنوں کا جھگڑا ہے، آئے گا اور چلا جائے گا۔''

لیکن لوگ تھے کہ باؤلے ہوئے پھرتے تھے۔ بری بری باتیں کرتے تھے۔ کہیں سے کوئی اچھی خبر نہ ملتی تھی۔ پھر پارو نے سنا کہ شہروں میں گلیاں خون سے بھر گئی ہیں۔ بازار مردوں سے اٹے پڑے ہیں۔ سڑتی ہوئی لاشوں سے بدبو اٹھنے لگی ہے۔ کوئی انہیں جلاتا پھونکتا نہیں۔ کوئی انہیں دفن نہیں کرتا۔ کوئی انہیں سپردِ آب نہیں کرتا۔ لوگ کہتے تھے کہ مردوں کی بدبو سے ملک میں بیماری پھیل جائے گی۔

پھر اس سال کی ۱۵ راگست بھی گزر گئی۔ پارو کے گاؤں میں ڈھول بجے، پارو کے گاؤں میں سبز رنگ اور چاند تاروں والے جھنڈے لہرائے گئے۔ اس کے گاؤں میں لوگ روز مسجد میں اکٹھے ہوتے تھے۔ پارو کے گاؤں میں سب ہندوؤں کے چہروں پر جیسے کسی نے ہلدی مل دی تھی۔

پھر پارو نے سنا کہ بعض شہر سرحد ہو گئے ہیں۔ ادھر مسلمان رہ گئے ہیں اور ادھر سب ہندو چلے گئے ہیں۔ پھر پارو کے سننے میں آیا کہ ادھر سے مسلمان لٹتے پٹتے آ رہے ہیں۔ کچھ راستے میں مر جاتے ہیں اور کچھ ادھر آ کر مر جاتے ہیں۔ پارو کے کان سن سن کر جیسے پھٹے جاتے تھے۔ اس نے سنا کہ مسلمان ہندوؤں کی لڑکیوں کو اور ہندو مسلمان کی لڑکیوں کو اٹھا اٹھا کر لے گئے ہیں۔ کئی لوگوں نے گھروں میں رکھ لی ہیں۔ کئی لوگوں نے مار دی ہیں اور کئی لوگوں نے ان کو ننگا کر کے گلیوں اور بازاروں میں جلوس نکالا ہے۔

گجرات کے ان گاؤں میں جو پارو کے گاؤں کے آس پاس تھے۔ سب سے بعد میں یہ حالت ہوئی۔ پارو کے اپنے گاؤں والے پارو کی اپنی برادری والے، پارو کے اپنے رشید کو چھوڑ کر، رشید کے سب رشتے دار وحشی بنے پھرتے تھے۔ پارو کا بس نہ چلتا تھا۔ رشید کے بس کی بات نہ تھی کہ وہ کسی کو سمجھائے بجھائے۔

آخر ان کے گاؤں کے آس پاس کے گاؤں کے ہندو بھاگنے لگے۔ ان کی گائیں کھونٹے سے بندھی رہیں۔ ان کی بھینسیں دھاڑیں مارتی رہیں۔ وہ اپنے بھرے ہوئے گھروں کو چھوڑ گئے۔ ان کے کھیت ان کا منہ دیکھتے رہے۔ وہ رات کو بھاگتے بھاگتے بھی گاؤں کی حدوں میں مارے جاتے تھے۔ وہ کوس چلنے کے بعد مرے ہوئے ملتے تھے۔ پارو کے گاؤں کے سب ہندو ایک بڑی حویلی میں پناہ گزیں تھے۔ کوئی دروازہ یا کھڑکی کھول کر باہر آتا تھا اسے موت دبوچ لیتی تھی۔ سننے میں آیا تھا کہ حویلی میں انہوں نے کھانے پینے کا سامان رکھا ہوا تھا۔ کوئی ہندو باہر نہیں نکلتا تھا۔ کوئی عورت باہر کی طرف نہ جھانکتی تھی۔

پارو کے گاؤں میں صرف مسلمان رہ گئے تھے۔ ہندو بند کئے جانوروں کی طرح حویلی میں پڑے ہوئے تھے۔ ایک دن اس گاؤں کے لوگوں نے مل کر حویلی پر حملہ کیا انہوں نے ٹھانی تھی کہ وہ حویلی والوں کو ختم کر دیں گے۔ انہوں نے بند گھروں کے تالے توڑ دیئے تھے۔ انہوں نے گھروں کو آپس میں بانٹ لیا تھا۔ کبھی رات کے وقت کوئی آدمی حویلی سے نکلتا تھا تو پارو گاؤں میں اس کی لاش پڑی ہوئی دیکھ لیتی تھی۔

ایک دن کسی طرح انہوں نے حویلی کے دروازوں اور کھڑکیوں پر تیل چھڑک دیا تھا۔ تیل سے بھیگی ہوئی کھڑکیوں کو آگ لگا دی تھی۔ لیکن ہندو فوج کے ٹرک گاؤں میں آ گئے۔ حویلی کے اندر سے آگ کے شعلوں کی مانند اونچی اونچی چیخیں نکل رہی تھیں۔ فوج نے آگ بجھائی..... اندر سے آدمیوں کو نکالا۔ جلتے بھنتے لوگوں کو ٹرک میں بٹھا لیا۔ فوج نے تین ادھ جلے آدمیوں کو نکالا۔ جن کے جسم سے چربی بہہ رہی تھی۔ جن کا گوشت آگ میں جل جل کر ہڈیوں سے الگ لٹک رہا تھا۔ جن کے گھٹنوں اور کہنیوں سے اندر کا پنجر باہر نکلا ہوا تھا۔ ٹرکوں میں

لوگوں کے بیٹھتے بیٹھتے ہی ان تین ادھ جلے آدمیوں نے جان دے دی۔ ان کی لاشوں کو وہیں پھینک کر ٹرک چلے گئے۔ ان کے گھر والے چیختے چلاتے رہ گئے، لیکن فوج کو انہیں جلانے کا وقت نہیں تھا۔

پارو کا گاؤں سونا ہو گیا تھا۔ دوسرے مذہب کا کوئی آدمی بھی نہ رہ گیا تھا، صرف تین جلی ہوئی لاشیں حویلی کے سامنے پڑی ہوئی تھیں۔ جن کے پنجروں میں لگے ہوئے گوشت کو دو تین دنوں ہی میں گاؤں کے کتوں اور کوؤں نے نوچ لیا تھا۔

پارو کی آنکھوں میں جیسے کسی نے شیشے کے ٹکڑے ڈال دیئے ہوں۔ ایک دن پارو نے دیکھا کہ دس بارہ منچلے لڑکے ایک نوجوان لڑکی کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے اور ڈھول بجاتے ہوئے اس کے گاؤں کے پاس سے گزر گئے ہیں۔ پارو کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس دنیا میں بیٹی پیدا کرنا ہی حرام ہے۔

اس شام پارو نے گنے کے کھیت میں چھپی ہوئی ایک جوان لڑکی دیکھی جس کو رات کے اندھیرے میں پارو اپنے گھر لے آئی۔ اس لڑکی نے پارو کو بتایا کہ قریب کے گاؤں میں ایک کیمپ بنا ہوا ہے جہاں ہندو اکٹھے ہو کر انتظار کر رہے ہیں کہ فوج انہیں نکال کر دوسری طرف (ہندوستان) لے جائے۔ اس طرف کی فوج کیمپ کی رکھوالی کرتی ہے۔ لیکن ہر روز رات کو کچھ مسلمان آ کر چوری چھپے کیمپ کی جوان لڑکیاں چھین کر لے جاتے ہیں اور دوسرے دن صبح سویرے ہی کیمپ میں چھوڑ جاتے ہیں۔ اس لڑکی نے پارو کو بتایا کہ پوری نو راتیں ہو گئی تھیں کہ اس کو روز نئے نئے گھروں میں جانا پڑتا تھا۔ رات وہ کسی طرح اپنے لانے والے کو دھوکا دے کر بھاگ آئی تھی۔ بھاگتے بھاگتے اس گاؤں میں آ پہنچی تھی۔ جب صبح کا اجالا پھیل گیا تو اس کو پتہ نہیں لگتا تھا کہ وہ کہاں جائے۔ وہ سارا دن گنوں کے کھیت میں بھوکی پیاسی دبکی پڑی رہی تھی۔

...... پارو سے سنا نہ جاتا تھا۔ اس کی یقین نہ آتا تھا اس نے لڑکی کو پچھلے کمرے میں رکھ لیا۔ اس کمرے میں گندم رکھی ہوئی تھی۔ اور بھینسوں کے لئے دانہ اور بنولے رکھے ہوئے تھے......!

دوسرے دن دو آدمی پھرتے پھرتے آئے۔ انہوں نے پتہ کیا کہ کسی نے ایک لڑکی دیکھی ہے۔ وہ گھروں کے صحنوں میں بھی دیکھ گئے۔ لیکن کسی کو لڑکی کا سراغ نہ ملا۔ پارو کو پتہ نہیں لگتا تھا کہ اب بھی اس زمین میں سے پہلے کی طرح گندم کی سنہری بالیاں نکلیں گی۔ جس زمین کے ہونٹوں پر آدمیوں کا خون جم گیا تھا...... کیا اس زمین سے مکئی کے بھٹوں کی سی طرح خوشبو آئے گی جس پر ادھر ادھر مردے سڑ رہے تھے...... کیا یہ عورتیں ان مردوں کے لئے پھر بھی بچے پیدا کریں گی جنہوں نے ان عورتوں جیسی عورتوں کو ذلیل و خوار کیا ہے؟

پارو کے گاؤں کے سامنے ایک گزرتا ہوا قافلہ آیا۔ لوگوں کی ٹولیاں پیدل چل رہی تھیں۔ لوگوں نے ایک چھکڑے میں بچوں کو بھرا ہوا تھا۔ کچھ فوجی ان کے آگے آگے تھے۔ کچھ فوجی ان کے پیچھے پیچھے۔ لوگوں کی آنکھیں دھنسی ہوئی تھیں۔ راستوں کی مٹی اڑ اڑ کر بری قسمت کی مانند ان کے منہ اور سر پر پڑی ہوئی تھی۔ قافلے کو وہ رات پارو کے گاؤں میں گزارنی تھی۔ اس کا دل ٹھکانے نہیں ہوتا تھا۔ اس کو ایک ہی بات سوجھتی تھی کہ یہ سڑک رتووال سے آتی ہے۔ اس قافلے میں اس کا رام چند ضرور ہوگا۔ ایک آخری ملاقات...... بس ایک بار...... آخری بار...... اس کے بعد وہ اس ملک میں بھی نہیں رہے گا۔ اس کے بعد وہ کبھی اس کی خبر بھی نہ پا سکے گی...... اس کے بعد کبھی اس کے گاؤں کی ہوا بھی نہیں آئے گی......

قافلے والے بچے کھچے زیور اور روپے دے کر راستے کے گاؤں والوں سے اناج لیتے تھے۔ گاؤں میں سے کچھ مرد اور عورتیں جا کر ان سے سودا کر لیتے تھے

اور وہ پہرے والے فوجیوں کی دیکھ ریکھ میں سونے کے بھاؤ اپنا مکئی اور باجرہ بیچ
بیچتے تھے۔ اسی بہانے پارو نے جا کر قافلے پر نظر دوڑائی۔

پارو نے قافلے میں بیٹھے ہوئے رام چند کو دیکھا۔ رام چند نے رتو وال کے
کھیتوں میں کھڑی ہوئی اور آنسوؤں سے بھیگے ہوئے منہ والی پارو کو پہچان لیا۔
رتو وال کے کھیتوں میں پارو کا منہ پارو کی بے پناہ محبت نے بند کر دیا تھا۔ آج اس کا
منہ قریب کھڑے ہوئے پہرے کے فوجیوں نے بند کیا ہوا تھا۔ پارو کچھ نہ کہہ سکی۔

"تمہیں اناج کی ضرورت ہوگی؟" پارو نے رام چند کی طرف منہ کر کے کہا۔

"ہاں!" رام چند کی آنکھیں پارو کے چہرے سے چپکی تھیں۔

"اچھا" رام تیار رکھنا، میں رات کو پہنچ جاؤں گی۔" قریب کھڑے ہوئے
سپاہی کو دیکھ کر پارو نے رام چند کی طرف دیکھ کر کہا اور واپس چلی گئی۔

پارو نے رشید سے کہا کہ اسے گھر میں چھپی ہوئی لڑکی کو قافلے میں پہنچانا
ہے۔ اور وہ ہانڈی میں رکھے ہوئے آٹے اور گھی کو کپڑے میں باندھ کر لڑکی کو
ساتھ لے کر رات کے اندھیرے میں سوئے ہوئے قافلے کی طرف چلی گئی۔

سارا سارا دن اور ساری ساری رات پیدل چل کر لوگ تھکے ہوئے پڑے
تھے۔ چاہے ہر وقت کا خطرہ ان کے سروں پر چمگادڑوں کی طرح لٹک رہا تھا۔
پھر بھی لوگ گھوڑے بیچ کر سوئے ہوئے تھے۔

"میں رات کو پہنچ جاؤں گی۔" رام چند کے کانوں میں پارو کی آواز شام ہی
سے گونج رہی تھی۔ رام چند رات کے سونے اندھیرے میں کسی کے پاؤں کی
آہٹ کا منتظر تھا۔

پہرے کے فوجی گھوم پھر کر پہرہ دے رہے تھے۔ جب پارو پنجوں کے بل
چل کر قافلے میں آ پہنچی۔ رام چند کے سامنے اس نے گٹھڑی اتار کر رکھی اور لڑکی

کو اس کے پاس بٹھا دیا۔

"تو پارو ہی ہے نا۔" رام چند نے آج بھی رتو وال کے کھیتوں والا سوال کیا۔

"اب بھی کچھ پوچھنا باقی ہے؟" پارو نے ایک شکایت بھرے لہجے میں کہا۔
یہ پارو کی ساری زندگی میں پہلی اور آخری شکایت تھی۔ رام چند نے سر جھکا لیا۔

"میرے ماں باپ کی کوئی خبر؟" پارو نے ایک آہ بھر کر کہا۔

"وہ تو جب سے بیاہ کر کے گئے ہیں واپس نہیں آئے۔" رام چند کہتے کہتے
رک گیا۔

"بیاہ...... کس کا بیاہ؟" پارو کی سمجھ میں نہ آیا۔

"تیرے گم ہو جانے کے بعد انہوں نے چپ چاپ ایک رات تیری چھوٹی
بہن کے ساتھ میرے پھیرے کرا دیئے اور تیرے بھائی کے ساتھ میری بہن کے
پھیرے ہوئے۔ اس وقت سے وہ گاؤں واپس نہیں آئے۔ آج کل بھی سیام
میں رہتے ہیں۔ لیکن" ...... رام چند پھر کہتے کہتے رک گیا۔

"میری بہن ...... تو پھر وہ بھی قافلے میں ہوگی؟" پارو کے لئے رام چند سے
اپنی بہن کے بیاہ کی خبر بالکل نئی تھی۔

"نہیں، پچھلے دنوں تیرا بھائی آیا تھا۔ میری بہن کو چھوڑ گیا اور اپنی بہن کو لے
گیا تھا اگر یہاں ہوتی تو وہ بھی ......" رام چند کی آنکھوں سے چھم چھم آنسو
گر پڑے۔

"وہ بھی؟ ...... کیا ہوا ہے؟ کیسے؟ ......" پارو کی سمجھ میں بات نہ آئی تھی۔

"پتہ نہیں لگا کہ کس وقت میری بہن اٹھائی گئی۔ میں بوڑھی ماں کو پیٹھ پر
اٹھا کر قافلے میں چل رہا تھا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ لیکن قافلے میں
نہیں ہے......" رام چند نے اونچی آہ کو روک کر کہا۔ رام چند کی چیخیں نکلنے والی

تھیں۔لیکن اس نے اپنی پگڑی کا سرا منہ میں ٹھونس لیا۔''میری ماں پٹ پٹ کر نیلی پڑ گئی ہے۔'' رام چند نے کہا۔

پارو کی انتڑیاں بل کھا کر اکٹھی ہو گئیں۔

''کہیں پتہ کرنا۔اگر کوئی سراغ مل جائے، پتہ نہیں مر گئی ہے یا زندہ ہے؟'' رام چند نے آخری کوشش سے کہا۔

انتڑیوں میں اٹھتے ہوئے درد کی وجہ سے پارو سے بولا نہ جا سکا۔

''لاجو، شاید اس کا نام...... ہے'' پارو کو ایک پرانی بات یاد آئی۔اپنی منگنی کے وقت اس نے اپنے بھائی کی منگیتر کا نام سنا تھا۔

''ہاں اس کی بانہہ پر بھی اس کا نام گدا ہوا ہے۔'' رام چند نے بتایا۔فوجی اس طرح پہرہ دے رہے تھے۔سوئے ہوئے لوگوں کے بیچ بیٹھے رام چند اور پارو آہستہ آہستہ بات کر رہے تھے۔

''اس لڑکی کو تمہارے سپرد کرنا ہے۔اس کو اپنے قافلے کے ساتھ لے جاؤ۔ ہندوستان جا کر پتہ لگانا۔شاید بے چاری کے ماں باپ مل جائیں۔'' پارو نے لڑکی کا ہاتھ رام چند کو پکڑا دیا۔

''میرا بھائی یہاں آیا تھا۔کاش میں اسے ایک بار دیکھ سکتی......'' پارو نے بہت رنج سے کہا۔

''پچھلے دنوں جب تمہارے چھتو وانی کے کھیتوں میں آگ لگی تھی یاد ہے؟'' رام چند کہہ رہا تھا۔

''آگ...... ہاں، آگ لگی تھی، کیا یہ بات سچ ہے کہ وہ آگ میرے بھائی نے لگائی تھی؟'' پارو کو اس دن کا خیال آ گیا، جب رشید نے ایک افواہ بتائی تھی۔

''ہاں، اس نے ہی لگائی تھی، تیرا تو اس کو پتہ نہیں تھا کہ کہاں رہتی ہے اس

نے غصے میں رشید کے کھیت جلا دیئے۔''

پارو کو خیال آیا۔اس کا بھائی جوان ہو گیا تھا۔اس کے دل میں بہن کے انتقام کا جذبہ جاگ رہا تھا۔اس کے دل میں بہن کی یاد بستی تھی۔اس کے ساتھ ہی پارو کو نئی ہونی یاد آ گئی۔کسی نے اس کی بھابی کو اٹھا لیا تھا۔پتہ نہیں کس حال میں تھی وہ......اس کے رام چند کی بہن......

''مجھے سکڑیالے خط لکھنا، اپنا پتہ لکھنا، اگر لاجو کا کچھ پتہ لگا تو لکھ بھیجوں گی۔'' پارو کہنے لگی۔

رات کا اندھیرا چھٹتا جاتا تھا۔فوجی قافلے والوں کو جگانے لگے تھے۔قافلے کو بہت سفر کرنا تھا۔

پارو اٹھ کھڑی ہوئی۔اس نے رام چند کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اس سے اور کچھ نہ کہا گیا۔کھڑی ہوئی پارو نے قافلے سے باہر قدم نکالا ہی تھا کہ ایک فوجی نے پارو کے آگے لاٹھی تان دی۔

''تو کون ہے، کہاں چلی ہے؟''

''میں دانے بیچنے آئی تھی۔''

''کتنے میں بیچے ہیں، روپے دکھا۔'' فوجی نے زور سے پوچھا۔

پارو نے دوپٹے کے پلو میں ہاتھ چھپا کر اپنا چاندی کا کڑا اتار لیا۔اور فوجی کو دکھا کر جلدی جلدی گاؤں کی طرف بڑھنا شروع کیا۔

پتہ نہیں فوجی نے یہ بات سوچی یا نہیں کہ ہندو چاندی کے زیور کم ہی پہنتے ہیں۔اس نے دانوں کے بدلے میں چاندی کا کڑا کس سے لیا؟

راتوں کو چارپائی پر لیٹی ہوئی پارو چھت کے کالے شہتیروں کو دیکھتی رہتی تھی۔
پارو کا دل ان لوگوں کی بند کوٹھریوں میں گھومتا رہتا تھا جن کے اندر لوگوں کو بیٹیاں
لوگوں کی بہنیں، لوگوں کی بیویاں زبردستی رکھی گئی تھیں۔ ان ہی میں لاجو ہوگی۔
لاجو رام چند کی بہن اور اس کی اپنی بھابی۔

لاجو کا ان دیکھا منہ پارو کی آنکھوں کے سامنے آ جاتا تھا۔ ٹوٹے ہوئے پتے
کی طرح لاجو کا منہ، گرے ہوئے پر کی طرح لاجو کا منہ...... پارو سوچتی تھی کہ لاجو
شادی شدہ تھی۔ شاید اس کا کوئی بچہ بھی۔ اس کے دل پر کیا گزری ہوگی۔ اس کے
جسم کا کیا حال ہوا ہوگا۔ پتہ نہیں کہ وہ بدقسمت اس وقت کہاں ہے۔ میں اس کو
کہاں ڈھونڈوں میں اس کو کیسے پہچانوں۔ پارو سوچتی تھی کہ اس دن گنے کے
کھیت میں چھپی ہوئی لڑکی لاجو ہی ہوتی اور میں اس کو قافلے میں پہنچا دیتی۔ میں
اس کو رام چند کے حوالے کر دیتی

پارو نے سب باتیں رشید کو بتا دیں [illegible] چپ [illegible]۔ جیسے ہی
ہوسکے گھر پر [illegible]
جیسے بھی ہوتے [illegible] آنکھوں [illegible] نہیں ہوتے تھے۔ رشید نے اس
سے وعدہ کیا۔ وہ دونوں [illegible]

رشید کا خیال تھا [illegible] جو ہے تو رتووال ہی میں ہے۔ گھر سے وہ اپنے بھائی کے

ساتھ نکلی تھی۔ قافلے میں تو نہیں۔ اکٹھے ہوتے ہوئے لوگوں کی آبادی میں وہ
کسی کے ہاتھ چڑھ گئی ہے۔ رشید نے رتووال کے دو چکر لگائے۔ لیکن وہ لوگوں
کے گھروں میں کیسے دیکھتا۔ وہ گاؤں کی کتنی ہی دکانوں سے سودا سلف خریدتا۔ لیکن
اسے لاجو کا کوئی سراغ نہ ملا۔ اتنا اس نے ضرور سنا تھا کہ گاؤں کے کچھ لڑکوں نے
جاتے ہوئے قافلے میں سے دو چار لڑکیاں اٹھالی تھیں۔ رشید کو پختہ یقین تھا کہ
لاجو ان ہی میں ہے۔ اس گاؤں والے رشید کے واقف نہ تھے۔ رشید کا کوئی رشتہ
دار بھی اس گاؤں میں نہ رہتا تھا۔ کس کے پاس وہ چار دن رہتا کس سے وہ گاؤں کا
کوئی حال پوچھتا۔

پارو نے رشید کو ایک ترکیب سجھائی کہ وہ باؤلی والے سائیں کو جانتے
ہیں۔ دونوں بچوں کے ساتھ سائیں کی کوٹھری میں جا کر ٹھہریں۔ یوں بھی پارو کی
آنکھیں جاگ جاگ کر گھٹی گھٹی سی رہنے لگی تھیں۔

ہر روز صبح پارو نماز پڑھ کر باؤلی کے پانی سے آنکھیں دھوتی تھی۔ سائیں
کو شیرینی چڑھاتی تھی اور دن میں نئے کھیس لے کر گاؤں میں بیچنے کے لئے چلی
جاتی تھی۔

گاؤں کے مرد تو کھیتوں میں ہوتے تھے۔ عورتیں اکیلے گھروں میں اپنا کام
کاج کرتی رہتی تھیں۔ پارو ہر ایک گھر کے اندر جا کر پوچھتی تھی۔ پارو کھیسوں کی
اتنی اتنی قیمت بتاتی تھی کہ کسی سے قیمت طے ہی نہ ہوتی تھی۔ یوں بھی گاؤں میں
لوگوں کے پاس اپنے بنائے ہوئے کھیس اور دریاں بہت ہوتی ہیں نہ پھر انہیں
لوٹ مار سے بہت کچھ مل گیا تھا۔ کسی کو خریدنے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن پارو
ڈھیٹھوں کی طرح سے لوگوں کے گھروں میں جا پہنچتی تھی۔ اندر باہر دیکھتی تھی۔
عورتوں کو باتوں میں لگا لیتی تھی۔ گاؤں میں لوٹ کی بات چھیڑ دیتی تھی۔ کیا کیا کس

کس کے حصے میں آیا تھا۔ ہنس ہنس کے پوچھ لیتی تھی۔ پھر ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے مکانوں کی بات شروع کر دیتی تھی۔ پارو کو رام چند کے گھر کی پہچان نہیں تھی۔ لیکن اس نے باتوں ہی باتوں میں اس کے گھر کا پتہ لگا لیا تھا۔ رشید اور پارو کو شک تھا کہ جس نے لاجو کو اٹھایا ہے اس نے لاجو کے گھر کو بھی سنبھالا ہوگا۔ پارو نے اس گھر میں ایک دو پھیرے بھی لگائے۔ لیکن ایک بوڑھی عورت اسے ڈیوڑھی ہی میں سے واپس کر دیتی تھی اور کہہ دیتی تھی کہ انہیں کچھ بھی نہیں لینا ہے۔

ایک دن پارو جیسے کسی کے گھر میں زبردستی گھس جاتے ہیں، صحن میں چلی گئی۔

''اماں کچھ نہ لینا۔ مگر دیکھ تو لے۔ میں تجھ سے دیکھنے کا مول تو نہیں مانگتی ہوں۔'' پارو نے کھیسوں کی گٹھری زمین پر رکھ کر کھیس ادھر اُدھر بکھیر دیئے۔ صحن میں اس بوڑھی کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔

''اللہ فضل کرے، مجھے پانی کا گھونٹ تو پلا، صبح سے تھک گئی ہوں۔'' پارو نے بوڑھی کو ہمت سے کہا۔

''پانی چھوڑ کر چاہے لسی کا کٹورا پی لے، اگر تجھے کھیس اور چادریں بیچنی ہیں تو کسی شہر میں جا۔ وہاں لوگ سوت کاتتے ہیں نہ بنتے ہیں۔ گاؤں میں کس کے پاس کھیسوں کی کمی ہے۔'' بوڑھی نے پارو کو مشورہ دیا اور اندر کی طرف منہ کر کے آواز دی۔

''اے نیک بخت! لسی کا ایک کٹورا تو بھر کر لے آ۔''

پارو کا دل دھڑکنے لگا۔ اندر سے آنے والی نوجوان لڑکی کا منہ سچ مچ ٹوٹے ہوئے پتے کی طرح تھا اور گرے ہوئے پر کی طرح۔ پارو کا ماتھا ٹھنکا 'ہو نہ ہو یہ لاجو ہی ہے۔'

پارو کو کسی پر لاجو کے ہونے کا شک نہیں ہوا تھا۔ اس وقت تک پارو کو ایک لگن

تھی کہ کہیں لاجو دکھائی دے۔ اب پارو کو ایک لڑکی پر لاجو ہونے کا شک ہو گیا تھا۔ لیکن اسے یہ بات سمجھ نہ آتی تھی کہ کس طرح وہ اپنے شک کی تصدیق کرے۔

''لڑکی کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' پارو نے بوڑھی سے بڑی ہمدردی سے کہا، اور لڑکی کے ہاتھ سے لسی کا کٹورا لے لیا۔

''اچھی ہی ہے...... یونہی ذرا......'' بوڑھی نے بات آئی گئی کر دی۔

''نمک کی ڈلی ہے؟ ذرا لسی میں ملا لوں۔'' پارو نے لسی کا گھونٹ پی کر کٹورا منہ سے الگ کر لیا۔

لڑکی نے چپ چاپ نمک کی ڈلی لا کر پارو کو دے دی۔ پارو نے اس کے ہاتھ سے نمک کی ڈلی لیتے ہوئے اس کی ایک انگلی کو ذرا سا دبا دیا۔ لڑکی نے ذرا ڈر کر پارو کی طرف دیکھا۔ لیکن اس کے ہونٹوں پر ہنسی آئی نہ اس کے منہ سے کوئی لفظ نکلا۔ لڑکی گنے کے پھوک کی طرح چسی ہوئی تھی۔ پارو سمجھ گئی کہ یہی رام چند کا گھر ہے۔ اس کو پورا یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہ لڑکی لاجو ہی ہے۔

لسی پی کر کٹورا زمین پر رکھتے ہوئے پارو نے اس لڑکی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''آ میں تیری نبض دیکھوں۔ رنگ تو تیرا ہلدی کی طرح ہو گیا ہے۔'' کہتے کہتے پارو نے ایک ہاتھ سے اس کے بائیں ہاتھ کی آستین پیچھے ہٹا دی۔ اس کے ہاتھ پر ہندی میں اس کا نام لاجو گدا ہوا تھا۔ وہ پھر بھی نہ بولی۔ پودا اور ما گھ ہر کی طرح چپ اس کے ہونٹوں پر جمی ہوئی تھی۔

''کوئی دھاگا بنا دے نا...... لڑکی گھر میں رچ بس جائے۔ لڑکے سے بھی بات نہیں کرتی۔'' بوڑھی نے اترے ہوئے منہ سے کہا۔

پارو کو اپنا آپ ہی سنبھالنا دشوار ہو گیا تھا۔ پھر بھی پارو نے جلدی سے جواب

دیا۔ ''میرے پاس ایسا تعویز ہے کہ یہ دونوں ہی میں مکئی کے دانے کی طرح کھل جائے گی۔''

''میں تیری احسان مند رہوں گی۔ مجھے وہ تعویذ لا دے۔'' بوڑھی نے پارو کی چادر تھام لی۔

''لے، میں کل ہی لے آؤں گی، اللہ نے خیر کی، تو.....'' کہتے کہتے پارو نے کھیسوں کی گٹھری باندھ لی۔ لڑکی گونگے اور بہرے بُت کی طرح اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

کھیسوں کی گٹھری کے بوجھ سے آج پارو کی کمر ٹوٹی جاتی تھی۔ بہت مشکل سے پارو باؤلی والی کوٹھری میں پہنچی۔

''اب تو جان اور تیرا کام۔'' پارو نے رشید کو ساری بات بتا کر کہا۔

''کوئی ایسا طریقہ ہو.....'' رشید سوچنے لگا۔

''جیسے مجھے گھوڑی پر اٹھا لایا تھا، اب بھی ہمت کر.....'' پارو نے رشید کو ٹھوکا دیا اور ہنس پڑی۔

پھر پارو اور رشید کتنے ہی طریقے سوچتے رہتے لیکن کسی طریقے پر طبیعت ٹھہرتی نہیں تھی۔ رشید کا کہنا تھا کہ یہاں سے اُسے بھگا کر لے جانا تو دشوار نہیں ہے لیکن اس کو آگے کیسے پہنچائیں گے۔ پارو کو پہلے کبھی خیال نہ آیا تھا۔ لیکن آج اُسے ایک اور بات سوجھی۔ 'میرے باپ نے مجھے واپس نہ لیا۔ اپنی بیٹی کو تو اب اپنی بہو کو کیسے واپس لے لیں گے۔ اگر انہوں نے واپس لینے ہی سے نہ کر دی تو.....؟''

رشید نے پارو کو بتایا، کہ اب حکومت کی طرف سے اعلانات جاری ہوئے ہیں کہ زبردستی اٹھائی ہوئی لڑکیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر واپس کرو، کیونکہ ان کے بدلے

میں دوسری طرف کی تلاش کی ہوئی لڑکیاں ملیں گی۔ سب لڑکیوں کے ماں باپ انہیں واپس لے لیں گے۔

پارو کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ اس کے لئے ساری دنیا کے دھرم، اس کے راستے میں کانٹے بن کر بچھ گئے تھے۔ اس کے ماں باپ اس کو واپس نہیں لیتے تھے۔ اس کی سسرال والے اسے واپس نہیں لیتے تھے۔ آج سب مذہبوں کے غرور ٹوٹ گئے ہیں۔ آج.....' اپنے سب خیال پارو نے روک لئے۔ پارو صرف لاجو کے بارے میں سوچنے لگی۔

گھڑیاں گن گن کر پارو نے رات گزاری۔ دوسری صبح اس وقت کا اندازہ کرتی رہی۔ جس وقت لاجو کے گھر والی بوڑھی اپنے بیٹے کو کھیتوں میں روٹی دینے گئی ہوگی۔ پارو نے دو نئے کھیس سر پر رکھے اور اوڑھنی کے کونے میں کاغذ میں لپٹی ہوئی ایک چٹکی راکھ باندھ لی۔

لاجو کا بند دروازہ ہاتھوں سے کھولتے ہوئے پارو نے سب پیروں اور فقیروں کو یاد کیا۔ پارو کو بہت عرصہ کے بھولے ہوئے دیوی دیوتاؤں کے نام یاد آئے۔ اس سے پہلے کسی دن بھی خدا کا نام لیتے وقت پارو کہہ دیتی تھی۔ خدا اس کا سوتیلا باپ ہے۔ خدا کی وہ سوتیلی بیٹی ہے۔ کسی خدا کو بھی اس کا درد نہیں۔ لیکن آج پارو کو خوف سا ہوا۔ اس نے جھجکتے ہوئے خدا کو یاد کیا کہ کسی نہ کسی طرح اس کی ملاقات اکیلی لاجو سے ہو جائے۔

دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ بوڑھی اپنے بیٹے کو روٹی دینے گئی ہوئی تھی اور لاجو اکیلی آنگن میں ایک کھردری چارپائی پر پڑی ہوئی تھی۔

''اماں کہاں ہے؟'' پارو نے صحن میں قدم رکھتے ہوئے پوچھا۔

''کھیتوں میں گئی ہے'' لاجو نے کل کی کھیس بیچنے والی کو دیکھ کر کہا۔ کھیسوں

والی سے پیدا ہوئی لاجو کی دلچسپی لاجو کے منہ پر جھلک رہی تھی۔ لاجو چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

پارو کو یکایک اپنی ماں کا چہرہ، اپنی بہن کا چہرہ، اپنی بھابی کا چہرہ، لاجو کے چہرہ میں نظر آنے لگا۔ پارو لاجو کے گلے سے لگ گئی۔ اس کا دل رونے کو چاہا، اس کو محسوس ہوا کہ اس کا رونا دیواروں کو پھاڑ دے گا۔ اس کا رونا کھیتوں کو چیر جائے گا۔ اس کا رونا گاؤں سے گزر جائے گا۔ اس کا رونا شہروں کو پار کر جائے گا۔ اس کا رونا......

پارو نے اپنے رونے کو گلے سے باہر نہ نکلنے دیا۔

''تو لاجو ہے...... میری بھابی......'' پارو نے سب غبار اپنے دل میں دبا کر کہا۔

''تو پارو ہے۔'' لاجو نے اس کی چھاتی سے الگ ہو کر اس کا منہ دیکھا۔ لیکن لاجو نے پہلے کبھی پارو کو دیکھا نہیں تھا کہ وہ اس کو پہچان لیتی۔ پھر بھی لاجو کو پارو کا منہ ہو بہو پارو کے بھائی کی مانند معلوم ہوا۔ اپنے خاوند کے منہ کی طرح...... لاجو کو پیار آیا۔ جیسے وہ اپنے خاوند کے سامنے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکتی ہو۔ لاجو پارو کے پاؤں پر گر پڑی۔ لاجو کے دل پر جو گزری تھی، پارو کو محسوس ہوا کہ وہ اس کے اپنے دل پر گزری ہے۔ پارو کو کچھ بھی۔ پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔ پارو نے بھینچ بھینچ کر لاجو کو کلیجے سے لگایا۔

''کوئی آ جائے گا، لاجو! میری بات سن'' پارو کو وقت کا خیال آ گیا۔ لاجو کی ہچکیاں بند نہ ہوتی تھیں۔

''وہ کس وقت واپس آتی ہے۔'' پارو نے پوچھا۔

''مجھے کچھ پتہ نہیں۔ مجھے اپنے ساتھ لے چل۔'' لاجو الگ نہ ہوتی تھی۔ وہ پارو کے پاؤں سے لپٹی ہوئی تھی۔

''لینے تو آئی ہوں۔ اور کیا کرنے آئی ہوں، میری بات تو سن'' پارو نے

کندھے سے پکڑ کر لاجو کا چہرہ اوپر کیا۔

''ہائے مجھے لے چل۔''

''لیکن سنبھل کر بیٹھ، کوئی آ جائے گا۔''

''مجھے لے کر بھاگ چل۔ میں ساری عمر تیری غلام بن کر رہوں گی۔''

''پاگل نہ بن، ایسے میں بھگا کر کہاں لے جاؤں؟''

''ہائے میں کہاں جاؤں گی، میں یہیں تڑپ تڑپ کر مر جاؤں گی۔'' لاجو کی آنکھوں میں آنسو خشک ہی نہ ہوتے تھے۔

پارو ڈر رہی تھی، بات بھی نہ ہو سکے گی اور بوڑھی آ جائے گی۔ اس نے آنچل سے لاجو کا منہ پونچھا۔ اور اس کو واسطے دے دے کر چپ کیا۔

''کبھی تو اندر باہر جاتی ہے؟''

''نہ''

''لیکن صبح تو باہر کھیت میں جاتی ہوگی؟''

''آج اتفاق سے اماوس ہے، آج رات کو اگر تو باہر والے کنوئیں کے پاس آ سکے، تو وہاں رشید گھوڑی لے کر کھڑا ہوگا۔''

لاجو جیسے جھینپ گئی۔ اس کو اکیلے کنوئیں کے پاس پہنچنا ہی دشوار معلوم ہوتا تھا۔ پھر وہ رشید کو جانتی بھی نہ تھی۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو اس کی جان بھی سلامت نہ رہے گی۔

''میں گھر سے کیسے نکلوں گی؟''

''رات جب سب سو جائیں، اس وقت باہر نکل آنا۔''

''وہ تو شراب پیتا ہے، آج رات جیسے تیسے زیادہ شراب دے دوں گی، لیکن صحن میں بوڑھی......''

''بوڑھی افیم وغیرہ نہیں کھاتی؟''

"میں نے تو نہیں دیکھا۔"

"ایک بار اگر وہاں پہنچ جائے تو......"

"لیکن وہاں...... میں تو اُسے پہچانتی بھی نہیں۔ اگر تو وہاں ہو۔"

"وہ تو رات ہی رات میں فاصلہ طے کرلے گا۔ میں ہوئی تو دونوں راستے ہی میں رہ جائیں گے۔"

"میں نے اسے کبھی دیکھا نہیں۔"

"تو مجھ پر اعتبار کر۔ تیری تسلی کے لئے یہ میرے ہاتھ کی انگوٹھی اس کے ہاتھ میں ہوگی۔ دیکھ لینا۔"

"اگر آج رات موقع نہ ملا تو۔"

"پھر اس سے اگلی رات۔"

"وہ پوری تین راتیں تیرا انتظار کرے گا۔"

"گلی سے آہٹ سنائی دے رہی ہے۔ شاید کوئی آ گیا ہے۔"

پارو چارپائی سے نیچے بیٹھ گئی۔ چارپائی کی پائنتی کی طرف کھیس رکھ کر پارو نے اوڑھنی کے کونے میں بندھی ہوئی راکھ کی چٹکی کو دیکھا تاکہ بوڑھی آجائے تو وہ اُسے تعویذ دے سکے۔ لیکن ابھی بوڑھی نہیں آئی تھی۔

"اگر تو اس تعویذ کے بہانے مجھے روز کسی باؤلی یا کنوئیں پر لے جایا کرے، تو پھر ایک دن......" لاجو نے اپنی آواز اور زیادہ دبالی۔

"اس طرح مجھ پر پورا شبہ ہوجائے گا۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ تجھے لے کر گاؤں سے نکل جائے تو میں اس کے بعد بھی دو تین دن گاؤں میں آتی جاتی رہوں، کسی کو مجھ پر شبہ نہ ہو۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے اگر کسی نے راستہ ہی میں پکڑ لیا۔"

"پھر جو قسمت میں لکھا ہوا ہے پہلے ہی کون سے اچھے دن ہیں۔"

"لیکن میں ساری عمر کے لئے تمہارا بوجھ بن جاؤں گی۔"

"یہ باتیں پھر کریں گے۔ اب وقت نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں چلی ہی جاؤں۔ بوڑھی مجھے آج نہ دیکھے تو اچھا ہے......"

'ہائے مجھے بھی لے چل۔" لاجو بچوں کی طرح پارو سے لپٹ گئی۔ پارو نے دروازے کی طرف دیکھتے دیکھتے لاجو کو چھاتی سے لگالیا۔ "آج رات...... آدھی رات......کل پر مت ٹالنا۔" کہتی کہتی پارو کھیسوں کو سنبھال کر گھر سے باہر نکل گئی۔

بان کی چارپائی پر لاجو نے دونوں پاؤں پھیلا دیئے۔ آج لاجو کے سارے جسم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ پھر لاجو کو جیسے سب دیواروں میں سے آوازیں آئیں۔ "آج رات...... آدھی رات......" لاجو نے صحن کی ایک ایک اینٹ کو دیکھا، یہی میرا گھر تھا، یہیں میں پیدا ہوئی تھی۔ یہیں میں پلی بڑھی تھی۔ یہیں میں جوان ہوئی تھی۔ اسی گھر سے میری ڈولی گئی تھی۔ یہیں میں سسرال سے واپس آئی تھی سب اس گھر سے چلے گئے۔ لیکن میرا مردہ اسی گھر میں خوار ہوتا رہا۔ میں اپنے گھر میں پردیسی بن گئی۔ اسی گھر نے مجھے پیدا کیا، اسی گھر نے مجھے کھالیا۔ لاجو گھر کے دروازوں کی چوکھٹوں کو دیکھنے لگی۔ ان چوکھٹوں کو بھی شرم نہ آئی۔ انہوں نے مجھے ذلیل ہوتا دیکھا۔ ان دیواروں کو بھی لاج نہ آئی۔ انہوں نے میری عزت اترتے ہوئے دیکھی۔ لیکن آج...... آج رات کو...... آدھی رات کو...... سب دیواریں ٹوٹ جائیں گی۔ سب چوکھٹیں گر جائیں گی...... میں......

بوڑھی باہر کا دروازہ کھول صحن میں آ گئی تھی۔

"اچھے وقت سے چلی گئی ہے" لاجو نے دل ہی دل میں کہا۔

"آج اس کھیسوں والی کو آنا تھا، ابھی آئی تو نہیں۔" بوڑھی نے آتے ہی

پوچھا اور ہاتھوں میں لئے ہوئے ساگ اور سبزی وغیرہ کوزمین پر رکھ کر لاجو والی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

کھیسوں والی کا نام سن کر لاجو کے منہ پر رونق سی آ گئی۔ ''نہیں'' لاجو نے سر ہلا کر کہا۔

پھر لاجو سوچنے لگی، پارو کو کیسے پتہ لگا کہ میں یہاں ہوں۔ وہ مجھے کیوں ڈھونڈنے آئی۔ وہ کس گاؤں میں رہتی ہے۔ میں نے اس سے کچھ بھی نہ پوچھا۔ پوچھنے کا وقت ہی نہ تھا۔ آج رات کو...... آدھی رات کو...... پھر لاجو کے کانوں ہی سے یہ آواز اُٹھ کر اس کے کانوں ہی میں آنے لگی۔

''میں نے کہا کہ کچھ موٹھ ڈال کر ہانڈی میں چاول پکنے کو رکھ دے میں تو تھک گئی ہوں۔'' کہتے کہتے بوڑھی چارپائی پر بے جان سی ہو کر لیٹ گئی۔

جیسے کوئی جانے سے پہلے آخری بار کے کام کو جلدی جلدی ختم کرتا ہے۔ لاجو نے اٹھ کر موٹھ چنے اور چاول صاف کیے اور چولھے میں دو چار لکڑیاں لگا کر چھوٹی ہانڈی رکھ دی۔ پہلے اکثر بوڑھی آٹا گوندھتی تھی۔ لیکن آج لاجو ہی نے آٹا چھانا اور گوندھا۔

آج کا دن ٹوٹی ہوئی جوتی کی طرح بڑھتا جاتا تھا۔ بہت مشکل سے شام ہوئی، جب بوڑھی کا بیٹا گھر آیا۔ اس دن لاجو کو بہت غصہ نہ آیا۔ پہلے ہر روز جب لاجو اسے دیکھتی تھی تو اس کی تیور چڑھ جاتی تھی۔

ہانڈی میں بڑا چمچا چلاتے ہوئے آج تین بار لاجو کے ہاتھ سے بڑا چمچا چھوٹ گیا تھا اور دو بار اس کے ہاتھوں سے بیلن پھسل گیا تھا اور ایک دو بار اس کے ہاتھوں سے کانسی کا کٹورا گر پڑا تھا۔

''دھیان سے کام کر۔'' ایک دو بار بوڑھی نے بگڑ کر کہا۔

''آنکھیں ہیں کہ بٹن ہیں۔'' بوڑھی کے بیٹے نے بھی اس کو ٹوکا۔

لیکن آج لاجو کو بوڑھی کی کوئی بات بھی بُری محسوس نہ ہو رہی تھی۔ اس کے بیٹے کی بات جیسے وہ سن ہی نہیں رہی تھی۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ گھر کے برتن بھی بوڑھی اور اس کے بیٹے کا منہ چڑا رہے ہیں۔ لاجو میں آج بے پناہ ہمت آ گئی تھی۔ نہ اس کا دل ڈر رہا تھا۔ نہ اسے کوئی فکر تھی بس ایک مقرر کیا ہوا وقت نزدیک اور نزدیک آ رہا تھا۔ اب رات ہو جائے گی، ابھی سب سو جائیں گے اور پھر میں...... میں صابون لگے ہوئے ہاتھ سے چوڑی کی طرح کھسک جاؤں گی۔

پہلے لاجو جلتی بھنتی ہوئی شراب کی بوتل بوڑھی کے بیٹے کے سامنے لا کر رکھ دیتی تھی۔ آج لاجو خود ہی اٹھ کر اندر سے بوتل لے آئی۔ جو بوڑھی کے بیٹے نے الائچیاں ڈلوا کر دو آتشہ بنوائی ہوئی تھی۔ اور پرانی اور تیز ہونے کی وجہ سے الگ رکھی ہوئی تھی۔

بوڑھی کا بیٹا سوچ رہا تھا۔ آج لاجو نے موٹھ کی کھچڑی بھی ملائی کی طرح بنائی ہوئی ہے۔ آج وہ خود ہی شراب کی بوتل بھی نکال لائی ہے۔ آج وہ خوش ہے۔ آج......

بوڑھی اونگھ رہی تھی۔

''صحن میں سردی محسوس ہونے لگی ہے۔ میں نے تیری چارپائی اندر بچھا دی ہے۔ جا سو جا۔'' لاجو نے گھر کی مالکن کی طرح بوڑھی سے کہا۔ ایک بار تو بوڑھی نے لاجو کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔

''آج تو جیسے دن ہی پھر گئے ہیں۔ آج تو مجھے اسے تعویذ بھی پہنانا تھا، پہلے ہی اثر ہو گیا ہے۔'' بوڑھی نے دل ہی دل میں سوچا اور اندر جا کر لیٹ گئی۔

رات کا اندھیرا لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہا تھا۔ بوڑھی کا بیٹا شراب کے نشے میں چور ہو رہا تھا اور لاجو کو بازو سے پکڑ کر کھینچ رہا تھا۔

رات کا پہلا پہر بہت دیر سے گزر چکا تھا۔ بوڑھی کا بیٹا شراب کے نشے میں مست ہو کر چار پائی پر لیٹ گیا تھا۔ گھر کی دیواروں نے اور چھتوں کی کڑیوں نے جہاں اتنے ہیر پھیر دیکھے تھے۔ وہاں آدھی رات کے وقت یہ بھی دیکھا کہ لاجو دبے پاؤں ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کے گھر سے باہر نکل گئی۔

گن گن کے پاؤں رکھتے ہوئے لاجو کو خوف محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی اس کے پیچھے آ رہا ہو۔ کسی نے اس کو کندھے سے پکڑ لیا ہو، کسی نے اس کو گلے سے پکڑ لیا ہو۔ سردی کے باوجود لاجو کی کنپٹیوں پر پسینے کی بوندیں ابھر آئی تھیں اگرچہ رات اندھیری تھی لیکن چھٹکے ہوئے تاروں کی روشنی بھی لاجو کو کوندے سی محسوس ہو رہی تھی۔ لاجو اپنے گھر کی دیوار سے گزر کر ساتھ والے گھروں کے قریب سے گزرتے ہوئے سہم گئی۔ لاجو نے گردن پھیر کر لمبی دیوار کی طرف دیکھا۔ پوری گلی میں چپ کہرے کی طرح جمی ہوئی تھی۔ پھر لاجو نے گلی کی سیدھی راہ چھوڑ کر گھروں کے پیچھے والی لمبی راہ اختیار کی۔

گھروں کی قطار ختم ہو گئی۔ اس کے بعد باہر والے کنوئیں کے پاس پہنچنے کے لئے ایک میدان درمیان پڑتا تھا۔ یہاں لاجو کے پاؤں سے کپکپی شروع ہو کر ماتھے کی رگوں میں پھیل گئی۔ اس نے پیچھے مڑ کر قبروں کی طرح سوئے ہوئے گھروں کو دیکھا۔ ابھی تک کوئی قیامت نہ آئی تھی۔ ابھی تک قبروں سے اُٹھ کر کوئی نہ آیا تھا۔ اس کو اپنے سانس کی آواز بھی سنار کی دھونکنی کی طرح سنائی دے رہی تھی۔ لیکن اس کے پاس دلیلوں میں پڑنے کا وقت نہ تھا۔ اس نے ایک بار تاروں کی مدھم روشنی کی طرف دیکھا اور میدان میں سے گزرنے لگی۔

لاجو کے دل کو اندیشہ تھا کہ اسے میدان میں سے گزرتے ہوئے کوئی دور سے بھی دیکھ سکتا ہے۔ اس نے کپڑے بھی سفید ہی پہنے ہوئے تھے۔ اس کو سانو

اندھیرے میں اپنے کپڑوں کی سفیدی سے بھی ڈر لگ رہا تھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سارا میدان خالی پڑا تھا۔ کنوئیں پر ایک نظر ڈال کے اس کو ڈر محسوس ہوا کہ کنوئیں پر کوئی موجود نہیں ہے۔ رشید نہیں آیا۔ وہ کہیں کی بھی نہ رہی۔ اس کو واپس جانے کا خیال ناقابل برداشت تھا۔ کنوئیں کے ارد گرد اس نے چکر لگایا جیسے آج اس نے دل میں ٹھان لی تھی کہ اگر اسے کوئی پناہ نہ ملی تو وہ پھر اسی کنوئیں میں ڈوب جائے گی۔

چادر اوڑھے ہوئے قریب کی جھاڑیوں سے ایک آدمی نکلا۔ ''بہن! تو لاجو ہے۔'' اس آدمی نے اس کے قریب پہنچ کر چادر سے منہ نکال کر کہا۔

''میری نشانی دکھا دے بھائی۔'' لاجو نے رشید کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ رشید کے چہرے پر بے پناہ ترس مہر کی طرح لگا ہوا تھا۔ لاجو کا دل ٹھکانے ہوا۔ رشید نے ہاتھ کی انگوٹھی اس کے سامنے کر دی۔ ''تجھے پہنچا کر کل یا پرسوں پارو کو لے جاؤں گا۔'' رشید کنوئیں کی منڈیر سے اتر کر جھاڑیوں کے پار باندھی ہوئی گھوڑی کھول لایا۔ ''یا اللہ'' رشید نے ایک بار کہا اور لاجو کو ہاتھ کا سہارا دے کر گھوڑی پر بٹھا لیا۔

گھوڑی کو پہلی ایڑ لگاتے ہی رشید کے دل میں اس وقت کا خیال آ گیا جب اس نے پارو کو چھتووانی کے کچے راستے سے اٹھا کر اپنی گھوڑی پر ڈال لیا تھا۔ آج رشید حیران تھا کہ اسے پھر ایک بار اپنی گھوڑی بھگانی پڑی۔ گاؤں کی ایک اور نوجوان لڑکی بھگا کر لے جانی پڑی۔ آج جوانی کی قوت رشید کے بازوؤں میں نہ تھی۔ لیکن رشید سوچ رہا تھا کہ پارو کو بھگا کر جیسے جیسے وہ اپنی گھوڑی بھگاتا جاتا تھا تو من من کا پتھر اس کی روح پر پڑتا جاتا تھا۔ کئی سال اس کی روح پر ایک بوجھ پڑا رہا تھا کہ اس کی روح سے وہ من من کے پتھر ہٹتے جاتے ہیں۔ رشید جیسے ہلکے پھلکے پروں سے گھوڑی کو دوڑائے جا رہا تھا۔

صبح کے اجالے کے ساتھ ہی گاؤں میں لاجو کے گم ہو جانے کی خبر پھیل گئی۔ دودھ بلوئے جا رہے تھے۔ جب ہر گھر میں لاجو کے بارے میں باتیں ہونے لگی تھیں۔ آس پاس کے گاؤں میں ہندو کا نام و نشان نہ تھا۔ کوئی مسلمان یہ کام کیوں کرتا۔ لوگ حیران اور پریشان تھے۔

اُجالا پہر پہر بڑھ کے چڑھی ہوئی دھوپ بن گیا تھا۔ چولھوں میں اپلوں پر رکھی ہوئی دالیں پک گئی تھیں۔ عورتیں تندور گرم کر رہی تھیں۔ جلتی ہوئی کپاس کی من چھٹی کی خوشبو اور اُٹھتے ہوئے دھوئیں کے غبار تندوروں میں سے نکل نکل کر سارے گاؤں پر چھا گئے تھے۔ جب پارو نے گاؤں میں قدم رکھا۔

آج لاجو کے گھر کا دروازہ کسی مردہ جانور کے منہ کی طرح کھلا پڑا تھا۔ جب پارو نے اس گھر کے اندر پاؤں رکھا۔ صحن میں بکھرے ہوئے رات کے جھوٹے برتن پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ پارو کو معلوم ہو گیا کہ صبح سے کسی نے کچھ کھایا پیا نہیں۔

''اری، کہیں وہ کلموہی دکھائی دی۔'' بوڑھی کے ماتھے پر تیوریوں کے اتنے بل پڑے ہوئے تھے۔ جیسے کسی نے مٹی کی ہانڈی اس کے ماتھے پر پھوڑ دی ہو۔

''کون؟ اماں!'' پارو نے سر سے کھیس اتار کر صحن میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

''اری، وہ بدبخت! اللہ اسے اٹھائے۔'' بوڑھی نے ساری نفرت ماتھے کی

تیوریوں میں بھر کر کہا۔

''ہائے ہائے! کون؟ بہو کہاں ہے؟''

''اری! وہی مری تو بھاگ گئی ہے۔''

''ہائے ہائے! کس کے ساتھ؟ میں تو اس کے لیے تعویذ لے آئی ہوں۔''

''چولھے میں ڈال تعویذ کو۔ اسے تو پتہ نہیں، جن لے گیا ہے یا بھوت؟''

''چھوڑ، اماں۔ گاؤں میں سے کون اٹھا لے جاتا ہے۔ کھیتوں میں گئی ہو گی چلی آئے گی۔''

''رہنے دے کھیتوں میں گئی ہو گی۔ اب تو دوپہر ہو گئی ہے۔''

''لیکن اماں وہ روٹی کا ٹکڑا تو نہیں ہے، جسے کوے اٹھا لے گئے ہوں۔''

''یہی تو میں بھی کہتی ہوں، پتہ نہیں کسی کنوئیں میں ڈوب مری ہے، پتہ نہیں کسی تالاب میں گر پڑی ہے...... مجھے تو میں اس کا پہلے دن سے ہی بھروسہ نہیں تھا لیکن بدنصیب لڑکا ہی اس پر اعتبار کرتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ اب یہ کہاں جائے گی، اس کا کوئی آس نہ پاس......''

''کیوں؟ اماں! اس کے ماں باپ کس گاؤں میں رہتے ہیں؟''

''اری! اجڑ گئے، ماں باپ...... میں نے تو پہلے دن ہی کہا تھا کہ یوں پرائی اینٹوں سے گھر نہیں بنتے ہیں۔ لیکن اس کا دل ہی آ گیا تھا۔ بوڑھی کی کون سنتا تھا...... اب تجھ سے کیا چھپاؤں۔ سارا گاؤں جانتا ہے کہ یہ ہندوؤں کی لڑکی تھی۔ جب گاؤں سے ہندو بھاگنے لگے تو میرا لڑکا اسے کہیں سے لے آیا، اللہ جانتا ہے کہ میں نے تو پہلے دن ہی کہا تھا کہ بہن بیٹی سب کی ہوتی ہیں۔ اللہ دتہ تو یوں ہی پاپ کی گٹھری باندھ لایا ہے۔ کیسے اس پاپ سے سبکدوش ہو گا......''

''اچھا!...... یہ بات تھی، تب ہی اماں! وہ بہت پریشان سی لگتی تھی لیکن بھاگ

کر کہاں جائے گی۔ اس کا کوئی آس پاس تو ہے نہیں۔ کووں سے بچے گی، تو چیلیں گھیر لیں گی۔ میرے خیال میں تو وہ کسی کنوئیں یا کسی گڑھے میں گر گئی ہے۔ چاہے وہ جان کر مری ہے یا اس کی آئی ہوئی تھی۔''

''چلو، کلنک تو اترا۔ لیکن لڑکا تو میری ہڈیاں توڑ رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تو اندھی تھی تجھے پتہ نہیں لگا۔ وہ کوئی چڑیا کا بچہ تو تھی نہیں جس کو کسی نے جیب میں ڈال لیا ہو۔''

''لیکن اماں! وہ پہلے بھی کبھی اکیلے باہر جاتی تھی؟''

''اری کہاں جانا تھا۔ کس کے پاس؟ پہلے پہل جب میں لڑکے کو کھانا دینے جاتی تھی تو باہر تالا لگا جاتی تھی۔ پھر لڑکے نے بھی کہا اور میں نے بھی سوچا کہ یہ بے چاری کہاں جائے گی۔ اس طرح آدمی کا گھر میں جی نہیں لگتا۔ اگر آٹھوں پہر اس کے سر پر کھڑے رہو۔ تو وہ صرف دوپہر کے وقت ہی اکیلی رہتی تھی۔ کل بھی میں کھانا دے کر آئی ہوں تو یہاں اچھی بھلی بیٹھی ہوئی تھی۔ موٹھ ڈال کر رات کو کھچڑی پکائی۔ باتھے کا ساگ دیگچے میں تیار کیا۔ روٹیاں بنائیں۔ ہم ماں بیٹے کو کھلائیں۔ آپ کھائی۔ پھر میری چارپائی اندر بچھا دی۔ کہتی تھی اماں اب صحن میں سردی ہوگئی ہے...... لڑکے نے ذرا دارو پیا۔ پھر میں تو سوگئی۔ پتہ نہیں کس وقت ہونی ہوگئی۔ صبح اٹھ کر آوازیں دیں، لیکن کوئی ہوتا تو بولتا۔''

''کنوئیں وغیرہ تو دیکھ لئے ہیں۔ وہ کسی کے ساتھ جانے والی تو نہ تھی۔''

''جاتی بھی کس کے ساتھ......'' بوڑھی نے جھکے ہوئے سر کو گھٹنوں پر رکھ دیا۔

''حیرانی کی بات ہے، گوشت کی بوٹی تو نہ تھی جو بلی یا کتا کھا گیا ہے۔ گاؤں تو تم نے سب جگہ دیکھ لیا ہے؟''

''ہاں، صبح سے یہاں گاؤں کا ایک ایک آدمی آیا ہے۔ لوگوں نے سارے

علاقے کا چپہ چپہ ڈھونڈ ڈالا ہے۔ اب میرا اللہ دتہ اور گاؤں کے کچھ لوگ کنوؤں کو دیکھنے لگئے ہیں۔ کوئی بات نہیں۔ اگر اس کی لاش ہی مل جائے۔ تو لڑکے کو تسلی ہو جائے گی اور فکر نہیں رہے گی کہ کہاں گئی ہے۔ بیٹے کی جان سلامت رہے، عورتیں تو اور بھی بہت آ جائیں گی۔''

ابھی تک پارو فکر، غم اور دوسرے جذبات کو چہرے پر نمایاں کرتی رہی تھی۔ اب دو تین آدمی باہر سے آ گئے تھے۔

''ہم تو سب کنوئیں وغیرہ دیکھ آئے ہیں۔ اس کی تو کہیں ہڈی پسلی بھی نہیں ملتی۔'' کہہ کر تینوں آدمی صحن میں پڑی چارپائی پر بیٹھ گئے۔

''پیدا کرنے والوں کا سر کھائے۔ تو نے کیوں اپنی جان کو روگ لگا لیا ہے۔ کوئی بھوت پریت اٹھا لے گئے ہوں گے۔'' بوڑھی نے اللہ دتہ کی طرف منہ کر کے نہایت فکر اور تردد سے کہا۔

پارو نے پہچان لیا۔ یہی اللہ دتہ ہوگا۔ پارو کو لاجو کا اُترا ہوا منہ یاد آیا۔ اس کو اس کا منہ اس چڑیا کے بچے کی طرح معلوم ہوا، جس کی جان چیل کے پنجے میں کئی دن دبی رہی ہو۔

''میرے خیال میں وہ رات بے رات اُٹھ کر باہر گئی ہے۔ کوئی جانور اٹھا لے گیا۔'' ایک آدمی نے اللہ دتہ کی طرف منہ کر کے کہا۔

''یہاں گیدڑ یا لومڑی تو شاید ہوں، اور گاؤں کے قریب کون سا جانور آتا تھا۔'' دوسرے نے قریب سے کہا۔

''ہماری طرف سے چور لے جائیں۔ تو کوئی لقمہ تو منہ میں ڈال۔'' بوڑھی نے اپنے بیٹے کو دلاسے سے کہا اور اٹھ کر کھانا پکانے کا انتظام کرنے لگی۔

''اچھا اماں! اللہ تجھے چین دے، میں چلتی ہوں۔'' پارو نے کھیسوں کی بندھی

ہوئی گٹھری سر پر اٹھالی۔

''تو کون ہے؟'' اللہ دتہ نے پارو کی طرف گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ابھی تک پارو کو گاؤں کی عورت سمجھ کر اللہ دتہ نے خیال نہیں کیا تھا۔ لیکن کھیسوں کی گٹھری اُٹھاتے دیکھ کر اللہ دتہ نے اس سے کڑوے لہجے میں بات کی۔ ''یہ کون ہے؟''

''کھیس بیچتی ہے، اور کون ہے۔'' قریب سے بوڑھی نے جواب دیا۔

''میں نے پہلے تو کبھی تجھے اس گاؤں میں نہیں دیکھا؟'' اللہ دتہ نے شبہ سے پوچھا۔

''کتنے ہی دنوں سے یہاں کھیس بیچتی ہے۔'' بوڑھی نے پھر سختی سے جھاڑتے ہوئے کہا۔

''لیکن تو کس گاؤں سے آئی ہے؟'' اللہ دتہ نے پارو کی طرف منہ کر کے کہا۔

''دو بچے میری گود میں ہیں۔ اس طرح گاوؤں میں گھوم پھر کر چار پیسے پیدا کر لیتی ہوں۔'' پارو کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ پر لگا کر یہاں سے اڑ جائے۔ کیوں وہ گاؤں میں رہ گئی۔ رات کو ہی وہ ساتھ چلی جاتی تو کسی کو اس کی چنتا نہ ہوتی۔

''لیکن تو ہندو ہے یا مسلمان۔'' اللہ دتہ کا شبہ اس وقت بھی دور نہ ہوا تھا۔ اس کے دونوں ساتھی مسکرانے لگے۔

''کیا ارادہ ہے؟ اب اسے گھر میں رکھنا ہے؟'' اللہ دتہ کو قریب والے ساتھی نے چٹکی لیتے ہوئے کہا۔

''ہائی، بھائیو! میں ہندو کہاں سے آئی۔'' پارو نے دور پڑی ہوئی جوتی پاؤں میں ڈال لی اور گٹھری سنبھال کر باہر جانے لگی۔

''ہندو کا نام ماتھے پر تو لکھا ہوا نہیں ہوتا۔'' اللہ دتہ نے پھر زور سے کہا۔

''تیرا تو بھائی شبہ ہی دور نہیں ہوتا، میرا تو نام حمیدہ ہے'' پارو نے دہلیز میں

کھڑے ہوئے بائیں بازو پر لکھے ہوئے نام کو دکھایا۔

''جا، اری جا! اس کا تو سر ہی پھر گیا ہے۔'' بوڑھی نے دور ہی سے آواز دی۔

''مجھے کوئی پتہ ملا تو میں خود آ کر بتا دوں گی، اماں!'' کہتے کہتے پارو نے جلدی جلدی قدم گلی میں بڑھائے۔

باؤلی والی کوٹھری میں پارو نے اپنے دونوں بچے چھوڑے ہوئے تھے، جاوید اب بڑا ہو گیا تھا، چھوٹے بچے کو وہ بہلائے رکھتا تھا۔ پارو نے وہ رات گھڑیاں گن گن کر کاٹی۔ دوسری صبح رشید کو لاجو کو سکڑیالے چھوڑ کر پارو کے پاس واپس آنے والا تھا۔ وہ رات رتووال میں اس کی آخری رات تھی۔ پارو گھڑیاں گنتی ہوئی دونوں بچوں کو لے کر چارپائی پر لیٹ گئی۔

رتووال سے وابستہ پارو کی سب یادیں ختم ہو گئی تھیں۔ پارو کو پچھلی بار رتووال کا آنا یاد آیا۔ کھیتوں میں گھومنا پھرنا یاد آیا۔ پھر آخری دن کھیتوں میں رام چند کا ملنا یاد آیا..... پچھلی بار پارو نے رام چند کے کھیت دیکھے تھے..... اب کی بار پارو نے رام چند کا وہ گھر اور وہ صحن بھی دیکھا تھا جسے دیکھنے کی حسرت پارو کو برسوں سے تھی۔ پارو سوچنے لگی۔ اس گھر میں اسے گھر کی بہو بن کر آنا تھا۔ لیکن اس گھر میں اس کی بہن بہو بن کر آئی۔ اس گھر میں اس کا بھائی دولھا بن کر آیا۔ لیکن اس نے اس گھر کا منہ کب دیکھا۔ جب اس گھر میں گھر والوں کا سایہ بھی باقی نہ رہا تو اس گھر کے جڑوں میں اس نے صرف لاجو کا پنجر دیکھا..... شکر ہے، اس وقت تک لاجو چھٹکارا پا گئی ہے۔ پارو سوچنے لگی۔ آج تو وہ خود اس گھر کے پنجرے میں پھنسی ہوئی تھی۔ حمیدہ کے نام ہی نے اس کو بچا لیا۔

پتہ نہیں کس وقت پارو کی آنکھ لگ گئی اور رات کا اندھیرا آہستہ آہستہ صبح بن گیا۔

آنے جانے کا سالم یکہ کر کے رشید رتو وال آیا اور پارو کو لے کر سنگریالے واپس چلا گیا۔

لاجو کی دونوں موٹی موٹی آنکھیں بند دروازے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ پارو کے پہنچنے کی پہلی آہٹ ہی سے لاجو نے بند دروازے کی زنجیر کھولی۔ باہر سے بھی رشید نے تالا لگا دیا تھا۔ تاکہ گاؤں والوں کو شبہ نہ ہو۔ ڈیوڑھی کا دروازہ اندر سے بند کر کے پارو لاجو اور رشید اپنے مکان کے پچھلے کمرے میں یوں بیٹھ گئے، جیسے شیر سے ڈرے ہوئے ہرنوں کی ڈار کو جنگل میں کوئی پناہ کی جگہ مل جائے۔

لاجو اور پارو دونوں کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ایک ساتھ کھیلی ہوں۔ ایک ساتھ پرورش پائی ہو۔ دونوں ایک دوسرے کی جان ہوں۔ لیکن وقت پڑنے پر کئی برسوں سے بچھڑ گئی ہوں، اور آج کس آندھی اور طوفان کے بعد دونوں ایک دوسرے سے اچانک مل گئی ہوں۔ برسوں کی جدائی اور زندگی کی کہانیاں دونوں کے ہونٹوں پر جمی ہوئی تھیں۔ دونوں کی دونوں کہنے کے لئے بیتاب تھیں۔ دونوں کی دونوں سننے کے لئے بیتاب تھیں۔

کھا پی کر فرصت پائے ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی۔ رشید کو اس بات کا خیال تھا کہ وہ دونوں اکیلے بیٹھ کر ایک دوسرے سے دل کی باتیں کہہ سن لیں۔ دراصل رشید بنیادی طور پر دل کا برا نہ تھا۔ وہ سوچا کرتا تھا کہ پارو کے ساتھ کوئی اس کا لینا دینا

تھا ورنہ وہ ایسا نہ تھا کہ راہ چلتے کسی کی شریف بہن بیٹی کو زبردستی اپنے گھر ڈال لیتا۔ پارو کو اپنی بیوی بنا لینے کے بعد رشید نے کبھی آنکھ اٹھا کر کسی کی بہن بیٹی کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

دونوں بچوں کو سلا کر دونوں پچھلے کمرے میں چارپائیاں بچھا کر لیٹ گئیں۔ رشید اس دن قریب والے کمرے میں سویا۔

"رتو وال کا قافلہ اس گاؤں سے گزرا تھا۔" پارو ہی نے پہلے بات کی۔

"تو نے دیکھا تھا؟" لاجو اور پارو ابھی تک مل کر بیٹھی نہ تھیں۔ لاجو کو کچھ بھی پتہ نہ تھا کہ پارو نے اس کو کیسے ڈھونڈ لیا ہے۔

"میں تیرے بھائی سے بھی ملی تھی۔ تب ہی تو مجھے تیرا پتہ لگا۔"

"ہیں.....!"

"ہاں" اور رام چند کا چہرہ پارو کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

"تو نے اسے کس طرح پہچانا، تو نے تو اسے دیکھا بھی نہیں تھا۔" لاجو کے دل میں کتنے خیال پھر آئے۔ پارو اس کے بھائی سے منسوب تھی۔ اس کے بھائی کا بیاہ ہونے والا تھا اور وہ لاپتہ ہو گئی تھی۔ پھر اس کی چھوٹی بہن سے اس کے بھائی کی شادی ہوئی تھی۔

"میں نے اسے پہلے بھی ایک بار دیکھا تھا۔" پارو نے لاجو کو رتو وال کے کھیتوں کی سب باتیں بتائیں۔ یہ بھی بتایا کہ اس وقت تک اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ رام چند اس کا بہنوئی ہو گیا ہے۔

"مجھے کبھی کوئی خبر نہیں ملی، جس دن یہاں سے قافلہ گزرا تب دیکھا۔"

"مرے ہوئے لوگوں کو بھی لوگ یاد کرتے ہیں۔ ان کے نام پر شرادھ کرتے ہیں۔ کبھی کبھی میرا نام بھی گھر میں کوئی لیتا ہوگا۔" پارو کا جی بھر آیا۔

لاجو نے اسے بتایا کہ اس کا باپ دو سال پہلے گزر گیا تھا۔ اس کی ماں اکثر پارو کا نام لے لے کر بین کرتی تھی۔

"میری ماں کی قسمت، اس کی بیٹی بھی جیتے جی مر گئی، اور بہو بھی....."
پارو نے کہا اور پارو اور لاجو دونوں رو پڑیں۔

بوچڑ خانے کی گئوؤں کی طرح دونوں چارپائیوں کی بالیں سے لگی رہیں۔

"تو جب وہاں جائے گی اور میری ماں سے ملے گی تو اس سے کہنا کہ ایک بار مجھ جیتی کا منہ تو دیکھ لے۔" پارو نے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے کہا۔

"میں...... میں وہاں کیا جاؤں گی....."

"تو اپنے گھر جائے گی، اپنے خاوند کے پاس، اپنے بھائی کے پاس۔"

"میں تو جیتے جی مر گئی ہوں، مجھے کون ساتھ رکھے گا۔"

"نہیں، لاجو! میں جیتے جی یہ بے انصافی نہ ہونے دوں گی، تو اپنے گھر جائے گی۔ اس میں تیرا کیا قصور ہے۔"

"لیکن تیرا کیا قصور تھا۔ تجھے ابھی تک گھر والوں نے قبول نہیں کیا۔"

"میری بات اور تھی، لاجو!"

"کیوں تیری بات اور تھی؟ تو کیا اپنی مرضی سے آئی تھی۔ تو بھی تو مجبور تھی۔"

"ہاں، لاجو! لیکن اس وقت میں اکیلی تھی۔ میرے ماں باپ کا حوصلہ نہ پڑا کہ وہ لوگوں کی باتیں سن سکیں اور میرے ماں باپ نے اپنی انتڑیاں کاٹ ڈالیں۔ اب تو ایک کو نہیں سب کے دل کو لگی ہوئی ہے۔"

"نہیں، پارو! میری قسمت اچھی ہوتی تو میرے ساتھ یہ ظلم ہی نہ ہوتا۔ مجھے معلوم ہے کہ مجھے کوئی قبول نہیں کرے گا۔"

"میں جو کہتی ہوں کہ تیرے بھائی کا خط ضرور آئے گا۔ ہم تیرا پتہ دیں گے تو

وہ تجھے لینے کے لئے ضرور آئے گا۔ میرا بھائی کیسا دکھائی دیتا ہے۔" پارو نے بڑے شوق سے پوچھا۔

لاجو کو اپنا خاوند یاد آیا۔ "وہ کیسے اس کا منہ دیکھے گی۔ وہ کیسے گھر والوں کا سامنا کرے گی۔ لاجو سوچنے لگی۔ جیسے اس کے دل کو یقین تھا کہ اسے کوئی لینے کے لئے نہیں آئے گا۔ یونہی دل بہلانے کو جو چاہے وہ سوچ سمجھ لے۔

"نہیں، لاجو! کوئی نہ کوئی تجھے لینے کے لئے ضرور آئے گا۔ آج کوئی کسی کو کسی کا طعنہ نہیں دے گا۔ سب لوگ اپنی بہنوں بیٹیوں کو لے جا رہے ہیں۔ رشید کہتا ہے کہ ادھر سے بھی لوگ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنی بیویاں لا رہے ہیں۔ کئی عورتوں کے بچے بھی ہو گئے ہیں۔" پھر دونوں گم سم ہو کر عورتوں کی بے بسی سوچنے لگیں۔

لاجو سوچنے لگی۔ ابھی تک اس کے یہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا، پتہ نہیں اس میں کس کا دوش تھا۔ یہی کس کا دوس اس کے حق میں اچھا ثابت ہوا۔ ورنہ معلوم نہیں اس کا حال کیا ہوگا۔

"جہاں وہ ایک کو روتے تھے۔ اب دو کو رو لیں گے۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی پارو۔ میں کس منہ سے جاؤں گی۔ میں تیرے بچوں کی خدمت کر کے روٹی کھا لوں گی۔"

"ایسے کیوں کہتی ہے لاجو! میرے زخموں پر نمک مت چھڑک، یہ تیرا اپنا گھر ہے! وہ تجھے ضرور لے جائیں گے۔ میں ساری دنیا کی منتیں کر کے انہیں مناؤں گی۔"

پارو نے لاجو کو بانہوں میں لے لیا۔ "تو اپنے گھر میں کیسی ہے، پارو!"

"رشید کی پیٹھ پیچھے کی بات ہے، کہ اس نے پہلا گناہ تو کیا سو کیا۔ پھر اس نے

مجھے کوئی بری بھلی نہیں کہی، وہ اگر میری مدد نہ کرتا تو میں تجھے کیسے ڈھونڈھ کر لا سکتی تھی۔"

"مجھے لانے میں اس نے اپنی جان جوکھوں میں ڈالی ہے۔ اگر اس راکھشس کو پتہ لگ جاتا تو وہ میری ہڈیاں جلا کر ہی پانی پیتا۔"

"وہ ہڈیاں کہاں جلاتا، اری پگلی! وہ لوگ تو دفن کرتے ہیں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے، لیکن پارو وہ اس گاؤں کا پتہ تو نہیں لگا لیں گے۔ میرا تو دل ڈرتا ہے۔ کہیں تمہارا بستا ہوا گھر بھی برباد نہ کروں۔"

"ابھی تک تو انہیں تیرے سائے کا بھی پتہ نہیں لگا......" پارو نے وہ سب باتیں بتائیں۔ جس طرح وہ لاجو کے گم ہو جانے کے بعد بوڑھی اور بوڑھی کے بیٹے سے ملی تھی۔

"پہلے بھی میں نے کئی دن تک اس کوٹھری میں ایک ہندو لڑکی چھپا کر رکھی تھی۔ کسی کو اس کا پتہ نہیں لگ سکا تھا۔ پھر اس دن میں اسے قافلے میں پہنچا آئی تھی۔ تجھے بھی اسی کوٹھری میں چھپا کر رکھنا ہے تاکہ گاؤں سے کوئی بات باہر نہ نکل سکے۔ جس دن خط آ گیا تجھے چپکے سے جا کر لاہور چھوڑ آؤں گی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔"

"اگر ان کا خط نہ آیا......"

"میرا دل گواہی دیتا ہے، لاجو! تیرا بھائی ضرور خط لکھے گا۔"

دن کے بعد دن گزرتے چلے گئے۔ ہر صبح سر اٹھاتی رہی۔ ہر شام سر جھکاتی رہی۔ لاجو کی کوئی خبر نہ نکلی۔ نہ لاجو کے گھر والوں کی کوئی خبر آئی۔ یوں تو پارو اور لاجو ایک دوسرے سے خوب گھل مل کر رہتی تھیں۔ جب رات کو نیند ان کی آنکھوں میں سما جاتی تو دونوں کی آنکھوں میں خواب ہی خواب بھر جاتے۔ منھ اندھیرے ہی اٹھ کر وہ ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگتیں۔ خوابوں کی تعبیریں سوچنے لگتیں۔ کبھی لاجو بچوں کی طرح چولھے میں سے کوئلہ لے کر زمین پر لکیریں کھینچنے بیٹھ جاتی۔ کبھی وہ منڈیر پر بیٹھے ہوئے کوے کو بولتے سے اندازہ لگاتی کہ آج کوئی آ رہا ہے۔ کئی بار وہ باتیں کرتی کرتی رو دیتی۔ کئی بار وہ پارو کے بیٹوں سے کھیل کھیل کر اپنا جی بہلا لیتی تھی۔ اس کا دل اکثر مایوسی بھری باتیں سوچتا تھا۔ اسے امید نہ تھی کہ کبھی کوئی اس کی خبر لے گا لیکن پارو کے دل کو نہ جانے کون اندر سے گواہی دیتا تھا کہ کسی دن یکایک ہی کوئی آ جائے گا۔ کسی دن اچانک ہی کوئی خط آ جائے گا۔ لاجو کے دن بدل جائیں گے۔ پارو اپنی طرف سے لاجو کی پوری خاطر تواضع کرتی تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ وہ اس کے پاس تھوڑے دنوں کے لئے امانت ہے۔ پھر شاید وہ اس سے کبھی نہ مل سکے گی۔ کبھی نہ دیکھ سکے گی۔ گھر کے دوسرے لوگوں کے چہرے بھی اسے لاجو کے چہرے دکھائی دیتے تھے۔ کون اس کے گھر رہنے کے لئے آئے گا۔ اس کے رشتہ داروں میں اس کے یہاں لاجو پہلی اور آخری مہمان تھی۔

دن کے اجالے میں لاجو کبھی دروازے سے باہر نہیں نکلتی تھی۔ رات کے اندھیروں نے لاجو کا راز نہایت وفاداری سے رکھا تھا۔ لیکن گاؤں کے ڈاکیہ نے تین پیسے کا پوسٹ کارڈ بھول کر بھی اس کے گھر نہ پھینکا۔

مختلف خیالات پارو اور لاجو کے چہرے پر جم گئے تھے۔ لاجو کے دل کو صرف یہ ڈھارس تھی کہ کبھی رشید اور پارو نے لاجو کے دل کو تھوڑا نہیں ہونے دیا تھا۔ لیکن سارا دن چھپی ہوئی اور گھر میں بند لاجو سوچتی تھی، پہاڑ سی عمر اس کے سر پر لٹک رہی ہے کب اس کے دن پورے ہوں گے۔

پارو کا کسی کے یہاں آنا جانا بھی بہت نہ تھا۔ لاجو پچھلی کوٹھری میں بیٹھتی تھی یا دوپہر کے وقت دروازے کو زنجیر لگا کر دونوں چرخے لے کر بیٹھ جاتی تھیں۔ پونیوں کے ڈھیر ختم ہو جاتے اور دن بیت جاتے لیکن خیال ختم نہ ہوتے۔

بھرپور سردی گزر گئی تھی۔ پھاگن کا مہینہ خاتمے پر آ گیا تھا۔ پانی میں ٹھنڈک کم ہو گئی تھی۔ ایک دن ڈھلتی دوپہر کے قریب جب رشید گھر کے اندر آیا تو لاجو اور پارو کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

سہمی ہوئی دونوں اس کے دائیں بائیں ہو گئیں۔ کچھ دیر تک رشید کے منھ سے کوئی بات نہ نکلی۔ لاجو کے کلیجے کو جیسے کوئی مٹھی بھر کر نکال رہا تھا۔ اسے یہی ڈر تھا کہ رتو وال کی بوڑھی اور اس کے بیٹے کو لاجو کا پتہ معلوم ہو گیا ہے۔ وہ اسے زبردستی لے جائیں گے، جانے پارو کے گھر پر کیا بیتے گی۔

رشید چارپائی کی بائیں پر بیٹھ گیا۔ قمیض کی آستین سے دونوں آنکھیں پونچھ کر اس نے لاجو کی پیٹھ پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ اس کے ہاتھوں کی وہی حالت تھی جو بیٹی کو سسرال روانہ کرتے ہوئے ایک بزرگ باپ کے ہاتھوں کی ہوتی ہے۔ رشید کا جی بھر آیا تھا۔ پھر اس نے دل کو قابو میں کر کے کہا۔

"آج رام چند آیا ہے۔"

"یہاں!" لاجو اور پارو دونوں کے منھ سے ایک ساتھ آواز نکلی۔

"ہاں اس کے ساتھ کچھ ہندوستانی پولس کے سپاہی ہیں اور کچھ پاکستانی پولس کے۔ لوگ اسی طرح گاؤں گاؤں وار شہر شہر اغوا کی ہوئی لڑکیوں کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ رام چند سے اکیلے میں ہی ملا۔ رشید نے بتایا۔

"سچ مچ مجھے لینے کے لئے آئے ہیں؟" لاجو نے یکلخت کہا اور کہہ کر اپنے آپ ہی شرمندہ سی ہو گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا سوال بے موقع ہے۔

"پگلی کہیں کی۔ اور کیا کرنے آئے ہیں۔" رشید نے کہا۔

پارو ابھی تک چپ تھی۔ اسے دل ہی دل میں عجیب سی خوشی ہو رہی تھی۔ اسے پتہ تھا کہ رام چند آئے گا۔ اسے پتہ تھا کہ اس کا خیال درست ثابت ہوگا۔ لاجو تو یونہی دل چھوٹا کر رہی تھی۔ جن دنوں رشید بھی مایوس ہو جاتا تھا پارو کے اندر سے کوئی گواہی دیتا تھا۔ رام چند ضرور آئے گا۔ وہ دن آج آ گیا تھا۔ رام چند سچ مچ آ گیا ہے۔

"اکیلا ہے؟" لاجو نے پوچھا۔

رشید سمجھ گیا۔ لاجو کا یہ پوچھنے سے کیا مطلب ہے۔

"ہاں ابھی تو اکیلا آیا ہے۔ لیکن تو فکر نہ کر تیرے گھر کے سب لوگ تجھے سر آنکھوں پر بٹھا لیں گے۔"

لاجو نے دل کو سنبھالا۔

"تیرا سن کر تیری خبر پا کر رام چند کا رونا نہ رکتا تھا۔ اس کو دیکھ کر تو دل بھر آیا تھا۔ رشید کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔ لاجو اور پارو بھی رو پڑیں۔

میں نے انہیں اچھی طرح سمجھا بجھا دیا ہے۔ آج اس طرح تجھے ان کو دینے

سے سارے گاؤں میں خبر پھیل جاتی۔ پتہ شاید رتو وال تک بھی بات پہنچ جاتی میں نے ان سے کہا ہے کہ تم لاہور واپس چلے چلو۔ میں لڑکی کو لے کر لاہور پہنچ جاتا ہوں، وہاں تمہارے حوالے کر دوں گا۔"

"یہ اچھا کیا۔" پارو نے جواب دیا۔

"ہم وہاں آج سے پانچویں دن پہنچیں گے۔ اس وقت تک وہ پارو کے بھائی کو بھی امرتسر سے بلا لیں گے۔ میں نے سوچا کہ ایک بار پارو بھی اپنے بھائی سے مل لے۔" رشید لاجو کی پیٹھ پر پیار سے ہاتھ پھیر کر کہہ رہا تھا۔

پارو کا رکا ہوا رونا اُبل پڑا۔ لاجو نے پارو کی گود میں سر رکھ کر اس کو اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ دونوں ایک دوسرے میں کھوئی ہوئی تھیں۔ دونوں کے غم مشترکہ ہو گئے تھے۔ دونوں کے آنسو ایک دوسری کے آنسوؤں میں مل گئے تھے۔

لاہور پہنچنے کا راستہ مشکل سے ڈیڑھ دن کا تھا۔ ابھی یہاں سے روانہ ہونے میں پورے تین دن باقی تھے۔

اگلے دن پارو نے بیسن پیسا۔ بھینس کا اکٹھا کیا ہوا مکھن نکالا۔ گری اور میوہ ڈال کر وہ دن بھر لڈو بناتی رہی۔ جیسے بیٹی کو سسرال بھیجا جاتا ہے۔ اس نے سچے کپڑوں کا ایک جوڑا نکالا۔ لاجو کے گلے لگا کر روتی رہی۔

تیسرے دن بچوں کو ساتھ لے کر پارو، لاجو اور رشید منہ اندھیرے گاؤں سے نکل کر گاڑی میں سوار ہو گئے۔

پچھلے چار دنوں سے پارو کو دو دو کر خیالات آ رہے تھے۔ وہ ساری ساری رات سوچتی رہتی تھی اور دل ہی دل میں کچھ طے کرتی رہتی تھی۔ میں لاجو سے کہوں گی کہ میری ماں سے جا کر یہ کہنا۔ میری ماں کو جا کر یہ بتانا۔ کم سے کم ایک بار تو مجھ جیتی کا منہ دیکھ لے۔ سوچتے سوچتے پارو کا جی بھر آتا۔

لاجو کو اپنے بھائی اور اپنے خاوند کا منہ دیکھنا اتنا ہی عجیب معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مر کے دوسری دنیا میں بچھڑے ہوئے لوگوں کے منہ دیکھنے کی امید رکھے۔ حالانکہ لاجو کو اپنے گھر سے بچھڑے ہوئے صرف پانچ چھ مہینے ہی ہوئے تھے۔ لیکن اسے بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ایک بار مر کے پھر اس دنیا میں آئی ہے۔ راستے بھر دونوں کے دل ہچکولے کھاتے رہے۔

پولس کے پہرے میں جب وہ ملے تو لاجو کی پلکیں اٹھائے سے نہ اٹھتی تھیں۔ پارو نے اپنے بھائی کا منہ دیکھا۔ ملاقات کی اس ایک گھڑی سے پہلے کس قدر طویل جدائی رہی تھی۔ کسی کے بھی آنسو روکے نہ رکتے تھے۔ مردوں کا بھی حوصلہ ٹوٹ گیا تھا۔ ہونی کے اس ٹوٹے ہوئے پہاڑ کی وجہ سے کسی کے پاس پوچھنے اور کہنے کے لئے کچھ نہ رہ گیا تھا۔ رو رو کے ان کے ہاتھ بھیگ گئے تھے۔

''خدا کے لئے کبھی بھول کر بھی لاجو کی بے قدری مت کرنا۔'' سب سے پہلے پارو بولی۔

لاجو کے خاوند کا منہ جھکا ہوا تھا۔ لاجو کے بھائی کا منہ جھکا ہوا تھا۔

''پارو ہمیں شرمندہ مت کر۔'' آخر لاجو کے بھائی نے کہا۔

لاجو کا خاوند کچھ نہ بول سکا۔ شاید وہ کچھ سن بھی نہ سکا۔ آج اسے صرف کھوئی ہوئی بیوی ہی نہیں ملی تھی بلکہ آج اس نے اپنے ہوش سے پہلے کی کھوئی ہوئی اپنی بہن بھی دیکھی تھی۔ برسوں سے اس کے دل میں ایک آگ سلگ رہی تھی۔ اسی آگ کی چنگاری اس نے رشید کے کھیتوں کو لگائی تھی جس کا سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ برسوں سے وہ اس شہزادی کی کہانی کو سوچتا رہا تھا جس کو ایک دیو اٹھا کر لے گیا تھا۔ پھر پورب دیس کا ایک راج کمار اپنے جادو والے تیروں کے زور پر چھڑا کر لے آیا تھا۔ بچپن میں وہ کئی سادھوؤں اور سنتوں سے جادو والے تیر مانگتا تھا۔ بڑا ہو کر وہ پارو کے متعلق سوچ سوچ کر بیتاب ہو جاتا تھا۔ آج برسوں کی

کھوئی ہوئی پارو اس کی آنکھوں کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ بھول گیا تھا کہ رشید نے اس کی بیوی کو بچایا ہے۔ اس وقت اسے صرف یہی یاد تھا کہ رشید نے اس کی بہن کو اٹھا لیا تھا!

پولس والوں کی لاری تیار ہو گئی۔ ہندوستانی پولس کے سپاہیوں نے آواز دی۔ ''آؤ، اس طرف جانے والے ہندو ایک طرف ہو جائیں۔ لاری تیار ہے۔''

رام چند نے رشید کے گلے سے لگ کر بار بار کہا۔

''تیری مہربانی۔ بھائی تیرا احسان کبھی نہ بھولوں گا۔'' رشید کے چہرے پر اس احسان کی خوشی بھی تھی۔ لیکن رشید کی نظریں لاجو کو بچا کر بھی شرمندہ تھیں۔ رشید کو پارو کا اٹھا کر لے آنا یاد رہا تھا۔ پھر بھی اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے سر کا بال کچھ تو ہلکا ہو گیا ہے۔

ایک آواز پھر آئی۔ ''اس طرف جانے والے ہندو ایک طرف ہو جائیں۔''

پارو نے سچے کپڑوں کا جوڑا اور بیسن کے لڈوؤں کی گٹھری لاجو کے ہاتھ میں دے دی۔ لاجو کو گلے سے لگایا۔ پھر آخری ملاپ کے لئے اپنے بھائی کے گلے سے لگ گئی۔

''پارو!'' پارو کا بھائی صرف اتنا ہی کہہ سکا اور اس نے پارو کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

''میری بات سن، اس وقت......'' پارو کے بھائی نے پھر حوصلہ کر کے کہا۔

پارو نے اپنے بھائی کی بات سمجھ لی۔ اس کو بھی ایک بار خیال آیا۔ ''اگر میں اس وقت کہہ دوں کہ میں ایک ہندو عورت ہوں تو مجھے بھی وہ اس لاری میں بٹھا کر ضرور لے جائیں گے۔ میں بھی واپس جا سکتی ہوں۔ میں بھی... لاجو کی

طرح.....ملک کی ہزاروں لڑکیوں کی طرح.....''

پارو کے رُکے ہوئے آنسو پھر اُمڈ آئے۔اس نے اپنے بھائی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور قریب کھڑے ہوئے رشید کے پاس جا کر اپنے بیٹے کو گلے سے لگا لیا۔

''لاجو اپنے گھر چلی جائے تو سمجھنا کہ پارو بھی اس کے ساتھ آ گئی ہے۔ میرے لئے اب یہیں ٹھکانا ہے۔'' پارو نے لاری پر چڑھتے ہوئے بھائی سے آہستہ سے کہا۔

رام چند نے جھکے ہوئے سر سے پارو کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔کوئی گہرا دکھ رام چند کے ہونٹوں پر جما ہوا تھا۔رام چند بول نہ سکا۔

'چاہے کوئی ہندو لڑکی ہو، چاہے مسلمان، جو بھی لڑکی ٹھکانے پر واپس پہنچ رہی ہے، سمجھو کہ اسی کے ساتھ پارو کی روح بھی ٹھکانے پر پہنچ رہی ہے، پارو نے دل ہی دل میں کہا اور دونوں آنکھیں جھکا کر رام چند کو آخری پرنام کیا۔

لاری چل پڑی تھی اور خالی سڑک پر گرد اُڑنے لگی تھی۔

